آوارگ کا آشنا
سفرنامہ
دلیپ سنگھ

آوارگی کا آشنا

سفرنامہ

دلیپ سنگھ

ساحل پبلیکیشنز نئی دہلی

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

تعداد: چھ سو

سن اشاعت: سنہ ۱۹۹۴ء

بار: دوم

خوشنویس: سبطین حیدر

سرورق: رضوان احمد فاروقی لکھنؤ

پروڈکشن: میڈیا انٹرنیشنل

۳۳۶۶ باغیچی اچھے جی، باڑہ ہندو راؤ دہلی ۶

طباعت: ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز

گلی گڑھیا، کوچہ چیلان، نئی دہلی۔

ناشر: ساحل پبلیکیشنز

ایل ۴ کناٹ سرکس، نئی دہلی۔

قیمت: ایک سو روپے

ہرچرن چاولہ، نصر ملک، چاند شکلا،
سعید انجمؔ اور بخشؔ لائلپوری کے نام
کہ جن کی محبت نے اس مختصر سے سفر کو
زندگی بھر کے لئے ایک یادگار بنا دیا۔

دلیپ سنگھ

پیش لفظ

ڈاکٹر قمر رئیس

اگر کوئی بیوروکریٹ، ظریف الطبع مزاح نگار بن کر سامنے آئے تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی آبدار خنجر نے سہ رنگا حریری غلاف پہن لیا ہو۔ اس کے برعکس اگر کوئی مزاح نگار، بیوروکریٹ یا ڈپلومیٹ بن جائے تو محسوس ہوتا ہے جیسے زعفران کے پھول کی پتی سے ہیرے کا یا کم از کم پتھر کا جگر کاٹا جا رہا ہو۔ میری دانست میں دلیپ سنگھ کے ساتھ مؤخر الذکر سانحہ ہوا ہے (اگرچہ کچھ لوگوں کی رائے اس سے مختلف بھی ہے) ایسا اس لئے کہ ان کا مزاح اکتسابی نہیں، آسمانی ہے۔ جو فطرت کی بیش بہا عطا کے طور پر ان کو ملا تھا۔ لیکن ایک عمر تک وہ اس سے نوکر شاہی اور ڈپلومیسی کی دنیا میں پتھروں کی تراش خراش کا کام لیتے رہے اور اصل وظیفہ یعنی طنز و مزاح سے دور رہے۔

ظرافت کے کوچے میں اُن کو نو وارد تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایسے کہنہ مشق بھی نہیں۔ یہی کوئی دس بارہ سال سے ان کا قلم فائلوں پر احکامات لکھنے کے بجائے یا ساتھ ساتھ قرطاس پر گلکاری کر رہا ہے اور بڑی صبا رفتاری سے۔ جیسے رہوار لمبا سفر طے کر کے جب اپنے گھر کی راہ پکڑ لیتا ہے تو اپنے شہسوار سے بھی نہیں رُکتا۔

دلیپ سنگھ نے گزشتہ دہے میں لگاتار تین چار مزاحیہ کتابیں طبع کرا کے ممتاز مزاح نگاروں کی صف میں اپنے لئے جگہ بنا لی ہے۔ ان کی فطانت، فطری ذکاوت، شوخیٔ طبع اور وہ حسِ مزاح جس کی تخم ریزی اور آبیاری دونوں پنجاب کی آب و ہوا میں ہوئی ان کی ظرافت کے خمیر میں شامل ہیں۔

عام طور پر کامیاب سفرنامے وہی ادیب لکھتا ہے جس کے تجسُّس اور تحیّر کی قوّت زوال آشنا نہ ہوئی ہو۔ وہ جب اجنبی دیاروں کی سیر کرتا ہے تو ہر شے اسے عجیب، انوکھی اور پُرکشش نظر آتی ہے۔ وہاں کی تہذیب اور انوکھے طور طریقوں کو دیکھ کر جی ہی جی میں وہ ہنستا اور خوش ہوتا ہے اور اپنی اس طرب انگیز دریافت میں اپنے سادہ دِل قارئین کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔ سفرنامے کے محرکات میں ایک بڑا محرک یہی ہوتا ہے۔ اور اکثر یہی سفرنامے کی دلچسپی اور نشاط آفرینی کا کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن "آوارگی کا آشنا" میں دو چار مقامات کو چھوڑ کر اس طرح کی تحیّر زائی نہیں ملتی۔ اس لئے کہ آوارگی سے مصنّف کی

شناسائی پُرانی ہے۔ پہلے بھی وہ مشرق اور مغرب کے کئی ملکوں کی سیاحت کر چکا ہے۔ اس کے تجسّس کی حس کچھ مضمحل ہو چکی ہے۔ اس لئے بھی کہ لندن اور اسکینڈی نیویا کے جن خطوں کی اس نے زیارت کی اس کے بارے میں یوسف خاں کمبل پوش سے رام لعل تک کتنے ہی سیّاح تفصیلی سفرنامے لکھ چکے ہیں۔ وہ ننھی جل پری کا مجسّمہ ہو یا میڈم تساڈ کا عجائب گھر، ان قابلِ دید مقامات کے بارے میں اردو والے، دلیپ سنگھ سمیت، پہلے ہی ضرورت سے کچھ زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔

دراصل مجھے لگا کہ دلیپ سنگھ کے اس سفرنامہ کا محرک کسی عجیب و غریب دنیا کی سیاحت نہیں تھی (ہفتہ عشرہ کے بندھے ٹکے سفر میں سیاحت ہو بھی کیا سکتی ہے۔) یہ سیاحت تھی ایک دوسری دُنیا کی۔ علم وادب اور معرفت کی دُنیا۔ مشترکہ ذوق، بے محابا محبت اور احساسِ دردمندی کے رشتوں سے بندھے ہوئے اہلِ نظر اور اہلِ قلم کی دُنیا، جو مشرق سے مغرب تک ہر قریہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تخلیق کاروں کی یہ دُنیا محدود ہونے کے باوجود بڑی وسعت رکھتی ہے۔ یہ مُلک وملّت، رنگ و نسل کے امتیاز سے آزاد ہوتی ہے۔ یہ انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھتی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتی، دُکھی روحوں کو نشاط و انبساط بخشتی اور (خواہ دلیپ سنگھ نہ مانیں) ظلم و استبداد کی ہر طاقت کے خلاف بے دریغ احتجاج کرتی ہے۔ "آوارگی کا آشنا" اسی عجیب دُنیا کے کیف و کم کی تلاش ہے۔

اس کے علاوہ مصنف نے جو واقعہ نگاری کی ہے اور شوخئ طبع کی جو گلکاری کی ہے وہ نازک رشتوں کے اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے ہے۔

جس علاقہ کا سفر کرنے کی نیت باندھ کر دلیپ سنگھ خوش ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس خطہ کے ادیبوں سے ان کے معنی خیز روحانی رشتے ہیں۔

ہرچرن چاولہ کے علاوہ وہاں جمشید مسرور (ناروے) سائیں سچا (سویڈن) سعید انجم اور نصر ملک (ڈنمارک) جیسے خوش ذوق جوشیلے پاکستانی ادیب ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے نصر ملک نے فون کر کے دلیپ سنگھ کو بتایا تھا کہ ان کا تعلق بھی اسی گاؤں، اسی مٹی سے ہے جہاں دلیپ سنگھ کا جنم ہُوا تھا۔ یہ بڑا یادگار دن تھا۔ دلیپ سنگھ اس دن کو یاد کرتے ہوئے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:۔

"... میں اس رات سو نہیں سکا۔ رات بھر میرے تصوّر میں بڑھ کا وہ عظیم الشّان درخت لہلہاتا رہا جس کی چھاؤں تلے میرا بچپن گزرا تھا۔ میں پیپل والے کنوئیں کے شفاف پانی سے سیر ہوتا رہا جس کی گادھی پر بیٹھ کر میں بولیاں گایا اور بنایا کرتا تھا۔ گاؤں کے پاس سے گزرتی ہوئی نہر میں ڈبکیاں لگاتا رہا جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا۔ اور گاؤں کی کچھ مٹیاروں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے جو میرے لئے حسن کا معیار بن گئے تھے۔ ایسا

معیار جس پر پھر کوئی چہرہ پُورا نہیں اُترا۔"

یہ صرف ماضی کی سہانی یادیں نہیں، ان کے فکر و تخیل کی پہلی گود، پہلا گہوارہ ہے۔ پھر اس مذاکرہ میں نارویجین زبان کے ادیب بھی شریک ہیں جو شعر و ادب کے مشترک عالمی مسائل کی باتیں کرتے ہیں۔ ان میں دو خواتین بھی ہیں جن کی پرکشش شخصیت سفرنامے کے ہیرو کو مسحور کر رہی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"جمشید مسرور نے ان کی تعریف میں اردو کے دو تین شعر پڑھ دیئے۔ شکرانے کے طور پر ایوا نے سیشن کے اختتام پر اُن کو ایک بوسہ دیا۔ مَیں نے بھی موقع غنیمت جان کر کہا کہ مَیں نے بھی دل ہی دل میں آپ کو بہت داد دی تھی۔ ایوا نے جواب دیا کہ" مَیں نے بھی دل ہی دل میں آپ کو بوسہ دے دیا تھا۔"

یہ لطیفہ طرازی سفرنامہ کی جان ہے۔ دلیپ سنگھ جب محسوس کرتے ہیں کہ سفر کی بوجھل تفصیلات سے قاری اُکتانے لگا ہے تو کوئی لطیفہ یا خندہ آور واقعہ اپنے مخصوص شگفتہ اسلوب میں جڑ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اکثر خود اپنی ذات کو بھی نشانۂ تمسخر بناتے ہیں۔ مذاکرہ میں اپنا مضمون پڑھنے سے پہلے وہ حاضرین سے کہتے ہیں:

"جب مَیں ناروے آرہا تھا تو مَیں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ وہاں سے تمہارے لئے کیا لاؤں۔ کہنے لگی" کوئی چھوٹی سی سجاوٹ کی چیز لے آنا۔" مَیں نے کہا" یہ تمہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا شوق

کیوں ہے۔" میرے پانچ فٹ تین انچ قد کو بغور دیکھتی ہوئی بولی
"اگر چھوٹی چیزوں کا شوق نہ ہوتا تو تم سے شادی کیوں کرتی۔"

دلیپ سنگھ کے احباب جانتے ہیں کہ وہ عام اور بے تکلّف گفتگو میں بھی مزاح کے بغیر لُقمہ نہیں توڑتے۔ مزاح ان کی زندگی، ان کے طرزِ فکر کا ایک حصّہ ہے۔ ٹھٹھول، بذلہ سنجی یا رعایتِ لفظی سے وہ کوئی ایسی دلچسپ صورتِ حال ضرور پیدا کر دیتے ہیں جو دوسروں کے لئے لُطف انبساط کا باعث ہو۔ مثلاً اُن کے رفیق سفر ڈاکٹر چودھری انھیں صحت بنانے اور اچھا انسان بننے کے مشورے دیتے رہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"اسی رفاقت کے دوران انھوں نے مجھے اچھا آدمی بننے کے مشورے بھی دیئے جن پر مَیں نے عمل اس لئے نہیں کیا کہ باقی بچی زندگی کو بے لُطف کیوں بناؤں۔"

دلیپ سنگھ اپنے سفرنامہ میں جگہ جگہ تقابل سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ یعنی ہندوستان اور اسکینڈی نیویائی ملکوں کی زندگی اور تہذیب کا تقابل۔ اس میں اگرچہ وہ جذباتی طور پر ملوّث نہیں ہوتے پھر بھی کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی چبھن محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً وہاں جب ایک ٹیکسی ڈرائیور ان کو منزلِ مُراد تک سلامتی سے پہنچا دیتا ہے تو وہ حیران ہوتے ہیں:

"حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس نے نہ تو لمبا راستہ لیا اور نہ منزل پر پہنچ کر زیادہ کرایہ طلب کیا۔ ان یوروپین لوگوں کو ہم سے کتنا کچھ سیکھنا ابھی باقی ہے۔"

اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ دلیپ سنگھ جس دیار کے مہمان تھے جنسی آزادی کے معاملہ میں دُنیا کا کوئی مُلک اس کا حریف نہیں۔ اور وہاں کے لوگ اپنی اس بے کراں آزادیٔ اختلاط پر فخر کرتے ہیں۔ دلیپ سنگھ نے وہاں کے کھُلے میدانوں میں، کھُلے جسم کے بہت سے منظر اپنی کھُلی آنکھوں سے دیکھے اور دل مسوس کر رہ گئے۔ آخر ان کی ملاقات میڈم رگمور سے ہوتی ہے جو ان کو اپنی فیملی کے بارے میں بڑی بشاشت سے بتاتی ہیں کہ اُن کی بیٹی کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی ہے۔ کچھ دن پہلے اس کے یہاں بیٹا ہُوا ہے۔ تب دلیپ سنگھ کو یاد آتا ہے کہ ہمارے ملک میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"مغرب سے جہاں اور بہت سی بدعتیں ہم نے لے لی ہیں، یہ کیوں نہیں۔"

یہ سچ ہے کہ مغرب میں دوستوں کے پاس سب کچھ ہوتا ہے، وقت نہیں ہوتا۔ وہ گھر لُٹا دیں گے، پیسے بہا دیں گے، لیکن وقت نہیں دیں گے۔ اس لئے وہاں خلوص و محبت کی کسوٹی یہ ٹھہرتی ہے کہ کون کتنا وقت دیتا ہے؟ ڈنمارک اور لندن میں نصر ملک، سعید انجم، چاند شکلا اور بخش لائلپوری نے اتنا وقت دیا، ایسا پیار دیا، اتنی سیر کرائی کہ دلیپ سنگھ نہال ہو گئے۔ یہ بے ساختہ اپنائیت، فراواں ایثار اور گھُل مل جانے کی ادا کچھ ادیبوں کے کنبہ میں ہی ہوتی ہے۔ قلندروں کی ان محفلوں میں بقولِ مصنف:

"لطیفے گھڑے جا رہے ہیں، شعر سُنائے جا رہے ہیں،

ادیبوں کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ جوش و خروش کا ایک ریلا تھا جس نے
ہم سب کو لپیٹ میں لے لیا۔"

یہی وہ ترغیب تھی جو اس سفر کا باعث ہوئی۔ ورنہ شاپنگ اور عیش کرنے کے لئے تو اب مغرب کے لوگ ایشیائی ملکوں کے کوچوں کی خاک چھانتے نظر آتے ہیں۔

"اس سفرنامچہ سے ایک بات ضرور منکشف ہوتی ہے کہ دلیپ سنگھ جو اپنی ضعیف العمری اور دل کی خرابی کے ہاتھوں دلی میں گوشہ نشیں سے رہتے ہیں، اپنی جوانی کی بچی کھچی توانائی اور ناکردہ گناہوں کی پوٹلی کو کہیں چھپا کر رکھتے ہیں اور اسے اسی وقت کھولتے ہیں جب وہ دیارِ مغرب میں دوستوں کے مہمان ہوں۔ اس سفرنامہ کے اوراق میں ان کی جو شبیہ اُبھرتی ہے، وہ اس دلیپ سنگھ سے خاصی مختلف ہے جسے دلی کے احباب دس بارہ سال سے جانتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب وہ سفر سے واپس آتے ہیں تو جیسے کوئی خفیہ بیٹری لگوا کر آتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک نئی تب و تاب پیدا ہو جاتی ہے اور قلم میں زیادہ جولانی آجاتی ہے جس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ سفرنامہ ہے۔ اس لئے ہم تو کہیں گے بقول ع

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

۱

پچھلے سال جب ناروے کی راجدھانی اوسلو میں مُقیم اُردو کے معروف افسانہ نگار ہرچرن چاولہ دِلی آئے تو ازراہِ کرم مجھ سے دفتر میں ملنے آئے۔ جب رخصت ہونے لگے تو اچانک کہا:

"اچھا، اب آپ کو اوسلو میں دیکھیں گے۔"

اُن کے کہنے کا انداز کچھ اس طرح کا تھا جیسے دریودھن ارجن سے کہہ رہا ہو کہ اب کوروکشیتر میں ملیں گے۔ میں بھی چونکہ کسی چیلنج سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں فوراً جواب دیا:

"ٹھیک ہے، وہاں دیکھ لیں گے آپ کو۔"

اور ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

چاولہ صاحب کا "چیلنج" تو دریودھن کے چیلنج سے کہیں زیادہ معرکہ خیز نکلا۔ چند مہینوں کے بعد مجھے ان کا ایک خط ملا۔ لکھا تھا:

"اوسلو کی ساہتک وچار سبھا ایک سیمنار کا اہتمام کر رہی ہے، جس کا موضوع ہے "ادب اور ثقافتی سرحدیں" اس سیمنار میں آپ کی

شرکت ضروری ہے۔ اپنی منظوری بھجوائیے۔"

ساہتک وچار سبھا کے جھنڈے تلے ہونے والے اس سمینار کو کئی نارویجین ادارے تعاون دے رہے تھے جن میں نارویجین رائٹرز یونین اوسلو سرفہرست تھی۔

ہندوستان سے کچھ بہت ہی قابل شخص اس سمینار میں حصّہ لینے کے لئے مدعو کئے گئے تھے۔ ایک تھے پروفیسر یو۔آر۔ اننتھامورتی ———— جن کا کنڑ لٹریچر میں ایک بڑا ہی معتبر نام ہے۔ ادبی شہرت تو ان کی مسلّم ہے ہی، اس کے علاوہ وہ بھارت سرکار کے معروف ادارے "نیشنل بک ٹرسٹ" کے چیئرمین[1] ہیں۔ دوسرا نام تھا پروفیسر اندر ناتھ چوہدری کا، جو ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ہیں اور تقابلی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ تیسرا نام اس خاکسار کا تھا۔ اور چونکہ میرا نام ان بڑے آدمیوں کے ساتھ آیا تھا، یقیناً مجھے بھی معتبر سمجھا گیا ہوگا۔

ساہتک وچار سبھا کے دعوت نامے میں مجھے ڈرانے کے لئے کافی سامان تھا۔ ایک تو یہی کہ میرے ساتھی بڑے قابل آدمی تھے۔ دوسرے یہ کہ سمینار انگریزی زبان میں تھا۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنی بات کو معتبر بنانے کے لئے جہاں ضرورت پڑے غالب کا شعر داغ دو۔ لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ میرے لئے جو موضوع تجویز کیا گیا تھا وہ نہ صرف میرے مزاج کے عین مطابق تھا، بلکہ مجھے یقین تھا کہ سامعین مجھے

---

[1] آج کل وہ ساہتیہ اکادمی کے پریزیڈنٹ ہیں۔

خوشی خوشی برداشت کریں گے۔ کیونکہ ہنسنا ہنسانا سب کو اچھا لگتا ہے خاص طور پر سیمیناروں میں جہاں شریف سے شریف سامعین قابل سے قابل لیکچرار سے گھبرا کر چوری چوری گھڑیاں دیکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میرا موضوع تھا "ادب میں طنز و مزاح"۔

چونکہ سیمینار ہندوستان سے باہر ہو رہا تھا۔ اس لئے پیپر لکھنے سے زیادہ ضروری کام تھا سفری کاغذات تیار کرنا۔ مَیں کئی سالوں سے وزارتِ خارجہ کا ملازم ہوں اور میری سفارش پر سینکڑوں لوگوں کے پاسپورٹ بنے ہیں اور انھوں نے دُنیا دیکھی ہے۔ لیکن جب میرا اپنا مسئلہ سامنے آیا تو مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر کتنا بھی تجربہ کار اور قابل کیوں نہ ہو، بے شک اس کے ہاتھوں سینکڑوں مریض شفا پا چکے ہوں، لیکن جب وہ خود اپنا علاج کرتا ہے تو اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ بیماری کتنی پریشان کُن ہوتی ہے۔

چنانچہ دس بارہ دن تو اسی دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ مَیں نے یہ جملہ محض ایک گھسے پٹے محاورے کو استعمال کرنے کے لئے نہیں لکھا، مَیں واقعی دس بارہ دن دھوپ میں دوڑتا رہا۔

جب طے ہو گیا کہ جانا ہی ہے تو مجھے خیال ہُوا کہ ڈنمارک ناروے کے بالکل قریب ہے، کیوں نہ اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ یہ خیال اس لئے نہیں آیا کہ مَیں وہاں کی ننھی جل پری کے مجسّے کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھا، بلکہ اس لئے کہ وہاں نصر ملک رہتا ہے۔ نصر ملک اُردو کا ایک جانا پہچانا افسانہ نگار اور شاعر ہے اور ریڈیو ڈنمارک کی اُردو سروس سے منسلک ہے۔ لیکن یہ بات میرے ڈنمارک کے سفر کے لئے اہم نہیں تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ نصر ملک میرے گاؤں کا

ہے۔ پاکستان کے اسی علاقہ میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ جہاں مَیں پیدا ہوا تھا۔

نصر ملک سے میرا تعارف بڑے عجیب و غریب انداز میں ہوا تھا۔ کلکتہ کے ادبی ماہنامہ "انشار" نے کچھ عرصہ پہلے مجھ پر ایک گوشہ شائع کیا تھا۔ اس گوشہ میں میرا بایوڈاٹا بمعہ میرے گاؤں کے نام کے شامل تھا۔ نصر ملک نے وہ پڑھا اور مجھے ڈنمارک سے فون کیا کہ مَیں بھی وہیں کا ہوں۔ مٹی کی کشش بھی ایک عجیب کشش ہے۔ مَیں اس رات سو نہیں سکا۔ رات بھر میرے تصور میں بڑھ کا وہ عظیم الشان درخت لہلہاتا رہا جس کی چھاؤں تلے میرا بچپن گزرا تھا۔ میں پیپل والے کنویں کے شفاف پانی سے سیر ہوتا رہا جس کی "گادھی" پر بیٹھ کر مَیں بولیاں گایا اور بنایا کرتا تھا۔ گاؤں کے پاس سے گزرتی ہوئی نہر میں ڈبکیاں لگاتا رہا جس میں مَیں نے تیرنا سیکھا تھا۔ اور گاؤں کی کچھ مٹیاروں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے جو میرے لئے حُسن کا معیار بن گئے تھے۔ ایسا معیار جس پر پھر کوئی چہرہ پُورا نہیں اترا۔

یہ سب سوچتے ہوئے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اب جب مجھے احساس ہُوا کہ یہ سب نصر نے بھی دیکھا ہوگا تو مجھے اس کے ساتھ ایک عجیب سی سانجھ محسُوس ہونے لگی۔ مَیں اس "ان دیکھے" ہم وطن کا تصوّر اس طرح کرنے لگا جیسے میرا ایک چھوٹا بھائی ڈنمارک میں جا بسا ہو۔ اس واقعہ کے بعد نصر سے باقاعدہ فون پر ملاقاتیں ہوتی رہیں جن کی وجہ سے یہ خواہش دل میں جڑ پکڑتی رہی کہ اس چھوٹے بھائی سے ملنا ضروری ہے۔

اب جب موقع نکلا تو مَیں نے نصر کو لکھا کہ مئی کے تیسرے ہفتے میں مَیں اوسلو میں ہوں گا۔ اگر تم اُن دنوں ڈنمارک سے باہر نہیں جا رہے تو تمہارے پاس آنا چاہوں گا۔ اس نے فوراً جواب دیا "آجائیے" اور پھر جب مَیں نے پوچھا کہ اس تک پہنچنے کے لئے مجھے کون سی سواری کا انتخاب کرنا ہوگا تو اس نے جواب دیا "آپ ناروے آجائیے بھائی جی۔ آگے کا بندوبست مَیں کر دوں گا۔"

یورپ کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہاں کے موسم کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ موسم وہاں ہندوستان کی طرح مہینوں کے حساب سے نہیں بدلتے، گھنٹوں کے حساب سے بدلتے ہیں۔ بنیادی موسم وہاں سردیوں کا ہی ہوتا ہے۔ گرمیوں کے مہینے بھی آتے ہیں لیکن ان مہینوں میں بھی سردیوں کا موسم چکر لگا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اپنی بیٹی کی آپ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد آپ کی ساس کبھی کبھی اُسے دیکھنے آجاتی ہے۔ چنانچہ سمجھدار لوگ اپنی رضائی کبھی صندوق میں بند نہیں کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ موسم کوئی بھی ہو، سوتے وہ لوگ رضائی میں ہی ہیں۔ سردیوں میں جو رضائی استعمال ہوتی ہے اسے رضائی کہتے ہیں اور گرمیوں میں جو رضائی استعمال ہوتی ہے اسے گرمیوں کی رضائی کہتے ہیں۔

یورپ کے موسم کے بارے میں میرا تجربہ مغربی یورپ تک محدود تھا۔ کہ وہاں میں چار سال گزار چکا تھا لیکن سکینڈے نیوین ملکوں کے بارے میں میرا تجربہ بس اتنا تھا کہ مَیں نے ان کے نام سُن رکھے تھے، یا پھر یہ سُن رکھا تھا کہ وہاں سردی بہت ہوتی ہے۔ لیکن مئی کے مہینے میں ہندستان میں بیٹھ کر یہ

تصوّر کرنا کہ کہیں اور سردی پڑ رہی ہے، آسان کام نہیں۔ چنانچہ مَیں نے سوچا کسی سمجھدار سے پوچھ لیا جائے۔

میرے علم میں تھا کہ مجھ سے پہلے میرے دو عزیز دوست مخمور سعیدی اور بلراج کومل ان ملکوں کی سیاحت کر چکے ہیں۔ مخمور کو فون کیا تو پتہ چلا کہ ہندستان کے مختلف شہروں میں مشاعرے پڑھنے نکل گئے ہیں۔ بلراج کومل دِلّی سے دُور کسی شہر میں اپنے بیمار سالے کی تیمار داری کے لئے گئے ہوئے تھے۔ مَیں جانتا ہوں کہ میرے دوست جان بوجھ کر دِلّی سے نہیں بھاگے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں بار بار اُردو کے وہ شعر اُبھر رہے تھے جن کا نفسِ مضمون یہ ہے کہ جب بھی دوستوں کی ضرورت پڑتی ہے، وہ بے وفائی اختیار کر لیتے ہیں۔

جب یہ دو صورتیں نظر نہ آئیں تو پھر ایک ہی صورت رہ گئی کہ نصر ملک سے پوچھا جائے۔ نصر ملک نے بتایا کہ موسم تو یہاں گرمی کا ہی ہے لیکن احتیاطاً اپنے ساتھ ایک برساتی اور اونی دستانے لیتے آئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ گرمیوں میں برساتی اور دستانے ساتھ لے کر چلنا کچھ عجیب سا لگے گا۔ نصر ملک نے میرے لہجے میں ہچکچاہٹ محسوس کی تو کہنے لگا کہ اگر یہ چیزیں آپ کے پاس نہیں ہیں، تو نہ سہی، یہاں سے انتظام ہو جائے گا۔ اس دن سے مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اُردو کے ادیب کے ساتھ بات کرتے ہوئے ہچکچانا نہیں چاہیئے ورنہ وہ آپ کو غریب اور نادار سمجھ لیتا ہے۔

اپنی عادت کے مُطابق مَیں نے اپنے میزبانوں کے لئے کچھ تحفے خرید لئے۔ ہرچرن چاولہ اور نصر ملک سے البتہ مَیں نے اصرار کیا کہ وہ اپنی پسند کی کوئی چیز مجھ سے

منگوالیں لیکن دونوں انکار کرتے رہے۔ میرے بہت زور دینے پر نصر نے کہا کہ میرے بیٹے کے لئے لکڑی کا ایک ہاتھی لے آنا کہ یہ اُسے بہت پسند ہے۔ مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ میرا بھتیجہ یورپ میں پیدا ہو کر بھی ہاتھی پسند کرتا ہے۔ اصلی نہیں تو لکڑی کا سہی۔ بڑے زمیندار وں کی اولاد کی کچھ نشانیاں تو ہیں اس میں۔

باقی تیاریاں مکمل ہو جانے کے بعد بھی میرے پاس دس دن بچ گئے تھے۔ جن میں مجھے سمینار کے لئے صرف ایک پیپر لکھنا تھا۔ میں اس پیپر کا خاکہ اپنے ذہن میں تیار کر رہا تھا کہ نصر ملک کا فون آیا۔ اس نے مجھے ایک موضوع دیا اور کہا کہ اس پر بھی ایک مضمون لکھ کر ساتھ لے آیئے۔ یہاں شاید ایک ڈینش اخبار خرید لے اور اگر ایسا ہو گیا تو آپ کو اڑھائی ہزار ڈینش کرونر معاوضہ مل جائیگا۔ میں نے جب حساب لگایا تو دس ہزار ہندستانی روپے بنے۔ معاوضہ کی رقم سُن کر میں تونڈاً وہ مضمون لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کمال یہ ہوا کہ اس مضمون کے متعلق بہت سی باتیں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ میرے ذہن میں آنے لگیں۔ پتہ نہیں اُردو ادب میں معاوضہ کا رواج کیوں نہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہم سب کو لکھنے میں کتنی آسانی ہو جائے۔

معاوضہ کی رقم سے مجھے یاد آیا کہ مرزا غالب نے مومن کا ایک شعر سُن کر کہا تھا:

"تم میرا پورا دیوان لے لو اور مجھے اپنا یہ شعر دے دو۔"

اُس وقت میری سمجھ میں نہ آیا کہ مرزا غالب اپنا پورا دیوان ایک شعر کے عوض کیوں دے رہے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ مرزا کو خیال ہوگا

کہ مومن کا یہ شعر شاید ڈنمارک میں بک جائے گا۔

یہ دو مضامین تو میرے ساتھ تھے ہی، مَیں نے احتیاطاً اپنے کچھ مضامین کے انگریزی ترجمے بھی ساتھ رکھ لئے کہ گاہک کا کیا پتہ کہاں بل جائے۔

چنانچہ اس فائدے مند سامان سے لدا پھندا مَیں کے ایل ایم کے طیارے میں مئی اکیس ۲۱ کی رات کو اندرا گاندھی ایئرپورٹ سے سوئے اوسلو چل دیا۔

۲

ھوائی جہاز کو ۲۲ مئی کی صبح ایک بجے اندرا گاندھی ایئرپورٹ سے روانہ ہونا تھا۔ میں چونکہ ائرپورٹ گیارہ بجے پہنچ گیا تھا، اس لئے میرے لئے صبح کا لفظ کچھ معنے نہیں رکھتا تھا۔ اکتیس کی رات کہہ لیجئے یا بائیس کی صبح، میرے لئے تو یہ "جگراتے" کی رات تھی۔

جہاز ایک کی بجائے تین بجے روانہ ہوا۔ میں نے جب ایک معتبر افسر سے پوچھا کہ دیر کیوں ہو رہی ہے، تو کہنے لگا کہ ہوائی جہاز کے معاملوں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے کہا "دیر تو سمجھ میں آتی ہے مگر یہ سویر کیوں ہو جاتی ہے؟

وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ خوش تھا کہ وہ ایک مسافر کو دیر کی صحیح وجہ بتانے سے بچ گیا۔ اور میں خوش تھا کہ آدھی رات کو بھی میں نے لطیفہ سنانے کے لئے ایک سامع پکڑ لیا۔

خیر صاحب، تین بجے جہاز سوئے منزل روانہ ہو گیا۔

سفرنامے کی روایت کے مطابق مجھے اب آپ کو یہ بتانا چاہیئے کہ جہاز

میں جو ائیر ہوسٹس میری خدمت پر مامور تھی وہ کتنی حسین تھی۔ اُسکی مسکراہٹ نے مجھ پر کیا جادو کیا اور کس اداسے اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے محبت کا پیغام دیا۔ ذکر تو تفصیل سے۔ مجھے اس ڈنر کا بھی کرنا چاہئے جو ائیر ہوسٹس نے مجھے بہت ہی پیار سے کھلایا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں سفرنامے کی اس روایت کو نبھا نہیں پاؤں گا۔ نیند کا مجھ پر اس قدر غلبہ تھا کہ میں نے جہاز میں بیٹھتے ہی اپنے اوپر کمبل ڈالا، بتی بجھائی، ائیر ہوسٹس سے گزارش کی کہ مجھے کھانے کے لئے نہ پوچھے، اور سو گیا۔

میں شرمسار ہوں کہ میں نے اپنے قارئین کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اُن کے ساتھ کوئی خاص زیادتی نہیں ہوئی۔ اگر میں ائیر ہوسٹس کے خدوخال اور قدوقامت کا ذکر چٹخارے لے کر بھی دیتا تو اس سے انھیں کچھ فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔ کیونکہ جب وہ میری تحریر کے جادو سے متأثر ہو کر کے ایل ایم کے اسی طیارے میں سفر کرتے تو شاید وہ ائیر ہوسٹس اس دن چھٹی پر ہوتی، یا پھر شادی ہو جانے کی وجہ سے وہ ملازمت سے استعفےٰ دے چکی ہوتی۔ اتنا تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ خوبصورت لڑکیوں کی شادی بہت جلد ہو جاتی ہے اور اکثر ایسے آدمی سے ہوتی ہے کہ پھر انھیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

جہاز میں مجھے وہ نیند تو نہ آئی جو اُردو محاوروں کے مطابق خرگوش کو عام طور پر اور انسان کو گھوڑے بیچ کر آتی ہے۔ لیکن جھپکیاں آتی رہیں — بیچ بیچ میں جب آنکھ کھلتی تو ٹی وی اسکرین پر نظر پڑتی۔ وہ لوگ بار بار یہ

دکھا رہے تھے کہ کتنے کلومیٹر کی مسافت طے ہو چکی ہے اور کتنے باقی رہ گئے ہیں اور کہ ہم کس راستے سے ہو کر جا رہے ہیں اور کب پہنچیں گے۔ مجھے ان باتوں میں کچھ دلچسپی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ جہاز ہے، کوئی بس نہیں ہے۔ منزل آجائے گی تو یہ لوگ خود ہی ہمیں اُترنے کو کہہ دیں گے۔ باقی رہ گئی یہ بات کہ ہم کس راستے سے جا رہے تھے، تو اس میں بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، حالانکہ اس سلسلے میں ایک بار بُری طرح مار کھا چُکا تھا۔ ایک بار نوکری کے سلسلے میں ایک انٹرویو میں مجھ سے پُوچھا گیا کہ اگر آپ دلّی سے بمبئی بذریعۂ ہوائی جہاز جائیں تو کس راستے سے جائیں گے؟

میں نے جواب دیا " پائلٹ کو راستے کا تو پتہ ہی ہوگا، وہ جس طرف سے لے جائے گا، چلے جائیں گے۔"

میرا جواب سُن کر انٹرویو بورڈ کے ممبر ہنس تو دیئے لیکن رزلٹ میں جب میرا نام نظر نہ آیا تو میری سمجھ میں آیا کہ وہ لوگ میرے جواب پر نہیں، بلکہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔

رات ختم ہو گئی، اس کا احساس مجھے اس بات سے ہوا کہ جہاز میں ناشتہ دیا جا رہا تھا۔ میں نے بھی مُنہ ہاتھ دھویا اور ناشتے کے لئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹیلی ویژن کی اسکرین سے ہی مجھے پتہ چلا کہ حالانکہ ہندوستان میں بائیس ئی کا دن اور رات ختم ہو چکے ہیں، یورپ کی بائیس کا دن ابھی نکلا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یورپ کے لوگ نہ صرف ہم سے نسلی امتیاز رکھنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے شب و روز بھی ہم سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں کہ کہیں میلے نہ ہو جائیں۔

مَیں نے جہاز میں اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے ساہتیہ اکادمی کے اندرناتھ چوہدری نظر آئے۔ ناروے میں چونکہ اُن کے ساتھ رہنا تھا' اس لئے مَیں نے ضروری سمجھا کہ اُن سے باقاعدہ تعارف جہاز میں ہی کر لیا جائے۔ چنانچہ مَیں اُن کی سیٹ پر گیا۔ چوہدری صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو شکل وصورت سے ہی پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں۔ میری طرح نہیں کہ زبان کے زور سے منوانا پڑتا ہے کہ مَیں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔

چوہدری صاحب بڑی محبت سے پیش آئے۔ اُن سے مِل کر مجھے محسوس ہُوا کہ اگر میں نے اُن کے سامنے کوئی نازیبا حرکت کی تو ایک ضابطہ پسند ہیڈ ماسٹر کی طرح مجھے ڈانٹ دیں گے۔ ناروے میں البتہ ان کے ساتھ پانچ دِن گزارنے کے بعد مجھے لگا جیسے مَیں نے کسی حد تک انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ وہ نہ صرف میری نازیبا حرکتوں پر مجھے ڈانٹ نہیں رہے تھے، بلکہ کئی نازیبا حرکتوں میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔

اوسلو کے ائرپورٹ پر ہرچرن چاولہ اور جمشید مسرور ہمارے استقبال کو کھڑے تھے۔ چاولہ صاحب سے تو خیر پُرانی محبّتیں تھیں، جمشید مسرور سے البتہ میری پہلی ملاقات تھی، حالانکہ مَیں اس کی شاعری سے بذریعۂ اَیوانِ اُردو دہلی، "انشا" کلکتہ اور پاکستان کے کئی پرچوں سے خاصا متعارف تھا۔

چاولہ صاحب نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ راستے میں کہنے لگے:

"یہاں سے آپ کے ہوٹل چلیں گے۔ وہاں آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اس کے بعد جمشید مسرور کی طرف سے لنچ کی دعوت ہے۔ آپ کو منظور ہے نا؟"

میں نے پوچھا: "کیا جمشید مسرور کے ہاں کھانا اچھا نہیں پکتا؟"

"کیا مطلب؟" چاولہ صاحب بولے

میں نے کہا "اگر کھانا اچھا پکتا ہے تو پھر نامنظوری کیوں؟" چاولہ صاحب ہنس پڑے۔

دونوں گاڑیاں سمندر کے ساحل کے قریب ایک بلڈنگ کے سامنے جا کر رک گئیں۔ چاولہ صاحب کہنے لگے:

"آئیے آپ کو تھوڑا سا اوسلو دکھا دیں۔"

میں نے کہا کہ اوسلو کی بجائے آپ مجھے میرے ہوٹل کا کمرہ دکھا دیں تو بہتر ہوگا۔

چاولہ صاحب نے جواب دیا:

"اوسلو ہم آپ کو دکھا ہی اس لئے رہے ہیں کہ ہوٹل کا کمرہ ابھی خالی نہیں ہے۔ ہوٹل والوں نے کہہ دیا ہے کہ کمرہ بارہ بجے خالی ہوگا۔ اس لئے یہ سیر ضروری ہے۔"

چاولہ صاحب ہمیں ایک میوزیم میں لے گئے جہاں اُن جہازوں کے نمونے رکھے تھے جن میں قدیم زمانے میں نارویجین ملاحوں نے سمندروں میں سفر کئے تھے۔ ہم تب تک اس میوزیم میں دلچسپی لیتے رہے جب تک بارہ نہیں بج گئے۔ بارہ بجتے ہی باقی سیر ملتوی کر کے ہم لوگ ہوٹل کی طرف چل دیئے۔

ہوٹل میں مجھے اور اندر ناتھ چوہدری صاحب کو ایک مشترکہ کمرہ دیا گیا۔ کمرے میں دونوں پلنگ اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ انھیں ایک دوسرے

جدا کرنا مُشکل تھا۔

چوہدری صاحب کو کمرہ پسند نہیں آیا۔ وجہ یہ بتا رہے تھے۔

"میں نے رات کو سیمنار میں پڑھنے کے لئے پیپر لکھنا ہے۔ اور اس لئے دیر تک جاگوں گا۔ صبح اُٹھ کر میں یوگا کرتا ہوں جس سے دلیپ پریشان ہوگا۔"

چاولہ صاحب نے پہلے تو بہانے سے ٹالنا چاہا کہ ہوٹل میں رش اتنا ہے کہ علیحدہ کمرہ ملنا مُشکل ہے۔ لیکن جب چوہدری صاحب کا اصرار بڑھتا گیا تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اُن کے بجٹ میں علیحدہ کمروں کی گنجائش نہیں ہے۔

چوہدری صاحب کی مُشکل کا حل ہوٹل والوں نے ایک منٹ میں تلاش کرلیا۔ انھوں نے ہمیں ایک بڑا کمرہ الاٹ کردیا جس میں چوہدری صاحب اور میں نہ صرف یوگا کر سکتے تھے، بلکہ کبڈی تک کھیل سکتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دونوں پلنگ نہ صرف ایک دوسرے سے علیحدہ تھے، بلکہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔

چوہدری صاحب کو یکایک احساس ہوا کہ کہیں میں نے ان کے علیحدہ کمرے کی خواہش کا مطلب یہ تو نہیں لیا کہ وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ چنانچہ وضاحت کرنے لگے۔ میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے ہرگز بُرا نہیں مانا، بلکہ میں تو دل ہی دل میں دُعا کرتا رہا کہ اُن کا مطالبہ پورا ہوجائے کیونکہ اس طرح میں بھی اُن کی رفاقت سے بچ جاتا۔

اس پر چوہدری صاحب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ وہ قہقہہ اس بات کی دلیل تھا کہ انھوں نے میرے وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔

میں نے اگلے چار دن ان کے ساتھ گزارے۔ اِن چار دنوں میں ہمارے درمیان جو دوستی کا سلسلہ قائم ہُوا وہ انشاءاللہ زندگی بھر چلے گا۔ انھوں نے مُجھے یوگا کی تعلیم تو نہیں دی، لیکن میری صحت کا خیال اس طرح رکھا کہ جیسے یہی اُن کے اوسلو آنے کا اصلی مقصد ہو۔ ہر قسم کی دوائیاں اُن کے پاس تھیں جو وہ مجھے وقتاً فوقتاً کھلاتے رہے۔ صبح کی چائے بھی وہ مجھے خود بنا کر پلاتے تھے۔ اسی رفاقت کے دَوران انھوں نے مجھے اچھا آدمی بننے کے مشورے بھی دیئے جن پر میں نے عمل اس لئے نہیں کیا کہ باقی بچی تھوڑی سی زندگی کو بے لُطف کیوں بناؤں۔

ایک بجا تو ہم لوگ جمشید مسرور کے گھر پر لنچ کے لئے چل دیئے۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میری طبیعت پر ایک طرح کا بوجھ سا ہے اور شاید لنچ نہ کھانے سے میری حالت سُدھر جائے۔ لیکن پھر وہ لطیفہ یاد آگیا کہ ایک پنجابی، گھر سے خودکشی کرنے کے ارادے سے ریلوے لائن کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ڈبہ بھی تھا۔ کسی نے پُوچھا جب خودکشی ہی کر رہے ہو تو پھر یہ ڈبہ کس لئے؟ کہنے لگا گاڑی کا کیا پتہ، شاید ہمیشہ کی طرح لیٹ ہو۔ میں مرنا تو چاہتا ہوں، پر بھوکا نہیں مرنا چاہتا۔" میں نے سوچا ہو سکتا ہے روٹی نہ کھانے سے میری طبیعت اور ناساز ہو جائے۔

جمشید مسرور کے گھر پہنچے تو اُن کی بیگم روبینہ اور بچے بہت محبت سے پیش آئے۔ کھانا میز پر رکھا تھا اس لئے سیدھے میز پر ہی جا بیٹھے۔ کیا پُرتکلف کھانا تھا! — لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے

آتارا تو میری طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔ شاید میری حالت میری صُورت سے عیاں تھی۔ اس لئے سب نے مشورہ دیا کہ میں کھانا نہ کھاؤں، بلکہ کچھ دیر آرام کرلوں۔ میری زندگی میں یہ پہلا اتّفاق تھا کہ اتنا لذیذ کھانا چھوڑ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے روبینہ سے کہا بھی کہ نیک بی بی اس میں سے کچھ کھانا میرے لئے بچا کر رکھ دینا میں کل آکر کھالوں گا، لیکن اس نے میری بات کو مذاق سمجھ کر ٹال دیا۔

میری صحت کے ضامن اندر ناتھ چوہدری صاحب نے مشورہ دیا کہ میں ہوٹل جا کر سو جاؤں کہ شاید نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میری یہ حالت ہوئی ہے۔ رات کی ایک دعوت میں بھی وہ مجھے نہیں لے گئے کہ ان کے خیال میں نہ کھانا ہی میرا علاج تھا۔ ڈاکٹر سے کوئی اُلجھ بھی تو نہیں سکتا۔

شام چار بجے کا سویا ہُوا میں دوسرے دن سویرے چھ بجے اُٹھا تو میری طبیعت بالکُل ٹھیک تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اندر ناتھ چوہدری نہ صرف ادب کے ڈاکٹر ہیں، بلکہ کئی انسانی بیماریوں کا علاج بھی جانتے ہیں۔ میں نے نہا دھو کر ہوٹل کے ریستوران میں ڈٹ کر ناشتہ کیا اور سیمینار میں حصّہ لینے کے چل دیا۔

۳

سمینار ناروجین رائٹرس یونین کے ہال میں منعقد ہونا تھا۔ ہمیں وہاں پہنچانے کی ذمہ داری ایک نوجوان ہندستانی انتھا کرشنن صاحب کی تھی۔ کرشنن پہلے ہندستان کی نیوز ایجنسی "پریس ٹرسٹ آف انڈیا" میں کام کرتے تھے۔ بعد میں ناروے جاکر بس گئے۔ میرا چونکہ اُن کے پُرانے دفتر کے ساتھ آج کل گہرا سمبندھ ہے، اس لئے اس مختصر سے سفر میں اُن سے خاصی دوستی ہو گئی۔ اسی سفر کے دَوران پتہ چلا کہ ہم دونوں میں ایک اور بات مشترک ہے۔ ناروے میں کئی سال رہنے کے باوجود وہ مقررہ ہال تک پہنچنے میں کئی بار راستہ بھولے اور مَیں دِلّی میں چالیس سال گزارنے کے بعد آج بھی لوگوں سے پوچھتا رہتا ہوں کہ انڈیا گیٹ کو کونسی سڑک جائے گی۔

ہال میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں ہندو پاک مردوں اور عورتوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ لگتا نہیں تھا کہ ان لوگوں کی دلچسپی صرف سمینار تک محدود ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ یہ سوچ کر اس ہال میں چلے آئے ہوں کہ آپس میں دو گھڑی مل بیٹھیں گے۔ اس چکر میں اگر کچھ تقریریں بھی سننی پڑیں تو سن لیں گے۔

مَیں نے دیکھا کہ ہال میں مَوجُود تمام عورتیں خوب سج دھج کر آئی تھیں۔ انھوں نے اپنی بہترین ساڑیاں زیب تن کی ہوئی تھیں اور بالوں میں پھولوں کے گجرے سجا رکھے تھے۔ اُن کے مقابلے میں مرد نہایت ہی معمولی لباس میں تھے۔ بہت سے ٹی شرٹ اور جینز پہنے ہوئے تھے۔ ان کے لباس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ہمارے مردوں اور عورتوں میں تفریح کا تصوّر کتنا مختلف ہے۔ عورتیں چھُٹی کے دن اپنی آرائش پر خصوصی توجہ دیتی ہیں کیونکہ کام کے دنوں میں انھیں بجنے سجلنے کی فرصت نہیں ملتی اور مرد اس دن شیو کرنا بھی ریاضت سمجھتے ہیں کہ ہر روز یہی تو کرتے ہیں۔

ایشیائی لوگوں کی تقریبًا ساری آبادی وہاں موجود تھی۔ اس کے باوجود ہال نصف سے زیادہ خالی تھا۔ منتظمین، خاص طور پر چاولہ اور ان کی اہلیہ بہت فکرمند تھے کہ اگر ہال نہ بھرا تو ہندستان سے آئے ہوئے مہمان کیا سوچیں گے۔ وضاحت کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے کہ ہال تو کب کا بھر گیا ہوتا لیکن موسم نے گڑبڑ کر دی۔ مَیں حیران کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اتنا حسین موسم تو ناروے میں بہت کم ہوتا ہے، جب ہلکی ہلکی دھوپ کی وجہ سے نہ صرف پارکوں اور گملوں میں پھول اگ آتے ہیں بلکہ دلوں کے کنول بھی کھل اُٹھتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ اتنے حسین موسم میں کون چاہے گا کہ وہ ایک بند کمرے میں بیٹھ کر ادب کے مسئلے پر لیکچر سُنے۔ گویا موسم اور سمینار ایک دُوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔

لیکن ادب کے مسائل کی بھی اپنی ایک کشش ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ آتے گئے اور کچھ ہی دیر میں ہال سامعین سے بھر گیا۔ عام طور پر یوروپین لوگ وقت

پابندی کو اپنی زندگی میں بہت اہم درجہ دیتے ہیں۔ اس سمینار میں ان کے دیر سے پہنچنے کی وجہ موسم کی خوشگواری کے علاوہ یہ بھی تھی کہ صبح کے سیشن کا پہلا ایک گھنٹہ رسم افتتاح کے لئے وقف کیا گیا تھا۔ وہ لوگ شاید جان گئے ہیں کہ ہندوستانی جب کسی تقریب کا افتتاح کرتے ہیں تو پھر کرتے ہی جاتے ہیں۔ سمینار کا افتتاح ناروے میں مقیم ہندوستان کے سفیر جناب سادھو رام چودھری نے کیا۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر میں سمینار کے ارباب بست وکشاد کو مُبارکباد دی کہ انھوں نے ہندوستان اور ناروے کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے روبرو بٹھا کر ایک دوسرے کو سمجھنے اور نزدیک لانے کا موقعہ دیا ہے۔

اس کے بعد ہرچرن چاولہ نے تفصیل سے اس سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور ہماری میزبان ساہتک وچار سبھا کی کارکردگی سے ہم سب کو روشناس کرایا۔

ہرچرن چاولہ نے اپنی تقریر میں اس ہال کا خصوصی طور پر ذکر کیا جس میں سمینار منعقد ہو رہا تھا۔ وہ شرارت بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے:

"پہلے یہ بلڈنگ کس کام آتی تھی، مَیں اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔"

مَیں نے سوچا تو مجھے لگا کہ پہلے اس بلڈنگ میں شاید مُجرا ہوتا ہوگا۔ چاولہ صاحب طوائفوں کا ذکر کرتے ہوئے شرما رہے ہیں۔ اُن کی تقریر کے دوران میرے کانوں میں گھنگھروؤں کی صدائیں آتی رہیں اور طبلے پر تھاپ پڑتی رہی۔ بعد میں ان کی زبانی معلوم ہوا کہ اس بلڈنگ میں پہلے میونسپلٹی کا دفتر اور بعد میں تھانہ تھا۔ یہ سُن کر مَیں خواب سے بیداری کے عالم میں آگیا۔

طبلے اور سارنگی کی بجائے اب میرے کانوں میں ایسی آوازیں آنے لگیں جو ہمارے تھانوں میں اکثر سُنائی دیتی ہیں۔ ویسے میرا تھانیدار دوست کہا کرتا ہے کہ شاعروں اور پولیس والوں میں گہرا سمبندھ ہے۔ شاعر دو مصرعے کہہ کر زندگی کی کسی سچائی پر سے پردہ ہٹا دیتے ہیں اور ہم پولیس والے دو اور دو چار کر کے مجرموں کو پکڑ لیتے ہیں۔

رسمِ افتتاح کی کارروائی کی نظامت ایک ہندستانی خاتون سجاتا پربھو کے سُپرد تھی۔ سجاتا نے اپنے دلکش اندازِ گفتگو سے شرکاء کا دِل جیت لیا۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ وہ انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتی ہیں۔

افتتاح کے بعد حاضرین کو کافی پیش کی گئی جس کے بعد باقاعدگی سے سمینار کا آغاز ہُوا۔

مقامی شرکاء میں دو نارویجین حضرات اور تین خواتین شامل تھیں۔ تھورو ولڈسٹین مشہور ادیب ہیں۔ اُن کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آج کل وہ نارویجین رائٹرز یونین کے چیئرمین ہیں۔ معروف ناول اور افسانہ نگار خاتون تھورل بریکے پہلے نارویجین رائٹرز یونین کی چیئرمین رہ چکی ہیں۔ آج کل وہ اوسلو کی چیئرمین ہیں۔ امریکہ کی پروفیسر گیل بیکمرجو ان دنوں برگن یونیورسٹی ناروے میں تعینات ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کے افسانہ نگار اور شاعر جمشید مسرور، ہرچرن چاولہ اور پورنیما چاولہ بھی ہال میں موجود تھے۔

پہلے سیشن میں "ادیب دو ثقافتوں میں" کے تحت پروفیسر انتھا موریتی، تھورل بریکے اور ہرچرن چاولہ نے اپنے مضمون پڑھے۔ اس سیشن کی نظامت انتھا

کرشن کر رہے تھے۔ انھوں نے کچھ اس انداز سے علمی بحث کا آغاز کیا کہ یہ سیشن ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بعد میں مَیں اُن سے مذاق کرتا رہا کہ پہلوانوں کو لڑانے کا فن آپ کو خوب آتا ہے۔

لنچ کے بعد دوسرا سیشن شروع ہُوا۔ اس سیشن کا نفسِ مضمون تھا: ہندستانی ادب میں مروّجہ رجحانات" لیکن اس سیشن میں بھی پہلے سیشن کی بازگشت سُنائی دیتی رہی۔

دُوسرے سیشن میں پہلا مضمُون پروفیسر اندرناتھ چوہدری کا تھا۔ پروفیسر چوہدری کا تعلق چونکہ مرکزی ساہتیہ اکادمی سے ہے، اس لئے ان کی گرفت اس موضوع پر بہت مضبوط ہے۔ دُوسرا مضمون پروفیسر اننتھامورتی کا تھا جس کا عنوان تھا" ایک مقامی بولی کا ادیب" دونوں حضرات کا تعلق چونکہ درس وتدریس سے ہے، اس لئے ان کو اپنی بات نہ صرف دلچسپ انداز میں کہنے کی عادت ہے، بلکہ ایک ایک نکتہ اپنے قارئین پر اس طرح واضح کر دیتے ہیں کہ گھر جا کر کتاب دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ بعد میں جب ان دونوں حضرات نے مجھ سے پُوچھا کہ ہمارے مضامین پر بہت کم سوال کیوں ہوئے؟ تو مَیں نے جواب دیا کہ طالب علم اپنے پروفیسروں سے سوال کرنے کی ہمّت کیسے کر سکتے ہیں۔

پروفیسر اننتھامورتی نے اپنے مضمون میں ایک نہایت دلچسپ بات کہی کہ ہمارے مُلک میں ادب کئی سطحوں پر لکھا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر رامائن نہ صرف کالیداس نے لکھی ہے بلکہ اس کے کئی فوک ورژن بھی ملتے ہیں جس میں لکھنے والوں نے اپنے مزاج اور ماحول کے مُطابق کئی تبدیلیاں کر لی ہیں۔ انھوں

نے بتایا کہ ایسی ہی ایک رامائن میں سیتا جب رام چندر جی کے ساتھ بن باس جانے کی پیش کش کرتی ہیں اور وہ انکار کر دیتے ہیں تو سیتا جواب دیتی ہیں کہ فلاں رامائن میں تو رام چندر جی نے انکار نہیں کیا تھا۔ یہ سُن کر ہال میں ایک قہقہہ گونج اُٹھا۔

پروفیسر اننتھا مورتی کا اندازِ تقریر بڑا دلکش ہے۔ سمینار کے بعد مَیں نے سنجیدہ انداز میں اُن کے لیکچر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جب آپ کہتے ہیں کہ کنڑ زبان میں بہترین ادب تشکیل ہو رہا ہے تو خواہ مخواہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسے جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ پروفیسر اننتھا مورتی کی حسِ مزاح بھی بہت تیز ہے۔

اس شام کو سمینار میں حصّہ لینے والے ادیبوں اور معتبر حاضرین کیلئے ہندستان کے سفیر سادھو رام چوہدری صاحب نے ایک استقبالیہ دیا جس میں پاکستان کے ناظمُ الامور خضر حیات خاں نیازی صاحب بھی شامل ہوئے۔ ویسے تو ایک سفارت کار کا دُوسرے سفارت کار کی پارٹی میں شامل ہونا ایک عام سی بات ہے، لیکن یہ ذکر اس لئے ضروری ہو گیا کہ ہمارے دو ملکوں میں سرکاری سطح پر کئی دفعہ اتنی دُوریاں آجاتی ہیں کہ ہمیں خُدا کا شکر ادا کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے اعلیٰ افسران کم از کم ایک دُوسرے کی دعوت میں تو شامل ہو جاتے ہیں۔

اگلے دن سمینار کا تیسرا سیشن تھا جو میرے امتحان کا دن بھی تھا۔ کیونکہ یہ میرے مضمون سے ہی شروع ہونا تھا۔ نفسِ مضمون کو ذہن میں رکھتے

ہوئے مَیں نے جگہ جگہ لطیفوں کی مدد لی تھی۔ شروع ہی مَیں نے ایک مزاحیہ واقعے سے کیا۔ مَیں نے کہا کہ جب مَیں ناروے آرہا تھا تو مَیں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ وہاں سے تمہارے لئے کیا لاؤں ؟

کہنے لگی "کوئی چھوٹی سی سجاوٹ کی چیز لے آنا۔"

مَیں نے کہا "یہ تمہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا شوق کیوں ہے ؟"

میرے پانچ فٹ تین انچ کے قد کو بغور دیکھتی ہوئی بولی "اگر چھوٹی چیزوں کا شوق نہ ہوتا تو تم سے شادی کیوں کرتی۔"

حاضرین کے زوردار قہقہے سے مجھے احساس ہوا کہ اب یہ لوگ میرے بس میں ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے میرے ایک ایک لفظ کو غور سے سُنا اور کھُل کر داد دی۔ مَیں نے اپنے مضمون میں کئی کام کی باتیں کیں لیکن انداز یہی رکھا۔ مَیں اُمید کرتا ہوں کہ حاضرین کو بعد میں وہ باتیں بھی یاد رہ گئی ہوں گی جنھیں مَیں کام کی باتیں کہہ رہا ہوں۔

میرے مضمون کو سُننے کے بعد حاضرین نے مجھ سے ہندستان کے مزاح نگاروں اور اُن کے فن کے مُتعلق کئی سوال کئے جن کا جواب مَیں اپنی بساط کے مُطابق دیتا رہا۔

میرے بعد ناروے کے مصنّف او برسیٹا نے اپنا مضمون پڑھا۔ تھورا وبریسٹا ناروے کے مشہور ناولسٹ، افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی اپنی بات کہنے کے لئے وہی حربے استعمال کئے جو مَیں نے کئے تھے۔ یعنی بات فلاسفروں کی لیکن انداز مسخروں کا۔

ہم دونوں جب اپنے مضامین پڑھ کر اور پیدا شدہ مسئلوں پر بحث کا جواب دے کر فارغ ہوئے تو لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ لنچ کے دوران مجھے کئی ادیب دوست یہ کہہ کر لطیفے سُناتے رہے کہ جب چاہوں انھیں استعمال کروں۔ مَیں نے کسی کو یہ بتانا مُناسب نہیں سمجھا کہ یہ سب لطیفے میرے مضامین میں موجود ہیں اور شاید انھوں نے وہیں سے پڑھے ہیں۔

سمینار کا آخری سیشن تخلیقات کو پڑھ کر سُنانے کے لئے وقف تھا۔ اس سیشن کی نظامت جمشید مسرور کے سپرد تھی۔ حالانکہ تمام کارروائی انگریزی زبان میں تھی لیکن جمشید اُردو کے شعر سُنانے سے باز نہیں آتے تھے جن کا بعد میں انھیں انگریزی ترجمہ سُنانا پڑتا تھا۔ ناروے کے ادیب دِل ہی دل میں اس بات پر تعجب تو کرتے ہوں گے کہ اُردو کے شاعر جب محبوب کے چہرے پر زلف کے بکھر جانے کی بات کرتے ہیں تو ساری دُنیا میں اندھیرا کیوں چھا جاتا ہے۔

اس سیشن میں مَیں نے اپنے مضمون "بھٹکا ہوا مسافر" کا انگریزی ترجمہ سُنایا اور سچی بات یہ ہے کہ حاضرین نے اسے بہت پسند کیا۔ دیگر تخلیقات جن پر خوب داد ملی سرچرن چاولہ، جمشید مسرور اور پورنیما چاولہ کی تھیں۔ نئے لکھنے والوں میں سُجاتا پربھو، مینا گروور، رشمی شاستری اور شیکھا چندرا نے بھی اپنی تخلیقات سُنا کر حاضرین کا دِل موہ لیا۔ ان سب نے اعتراف کیا کہ انھیں ادب کی طرف مائل کرنے میں چاولہ خاندان کی کوششیں شامل ہیں۔ گویا چاولہ خاندان نہ صرف خود ادب کی خدمت میں سرگرم ہے بلکہ ادبی کارواں میں نئے ممبر بھرتی کرنے میں بھی اُن کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

ناروے کے جن ادیبوں نے اس سیشن میں اپنی تخلیقات سُنائیں، ان میں اودے ماریانیسے، ایوا ارام، تھورل بریکے آسکر ستائن بیور لیکے اور اندا ریدے کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ تخلیقات تو ان سب کی قابلِ قدر تھیں، لیکن میں خاص طَور پر اودے ماریانیسے اور ایوا ارام سے متأثر ہُوا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اودے ماریانیسے کی شخصیت میں جو وقار اور جاذبیت تھی وہ دیکھتے ہی بنتی تھی اور ایوا ارام کا انداز مسخروں کا سا تھا لیکن بات بہت گہری کہتی تھیں۔ جمشید مسرور نے اُن کی تعریف میں اردو کے دو تین شعر پڑھ دیئے۔ شکرانے کے طَور پر ایوا ارام نے سیشن کے اختتام پر اُن کو ایک بوسہ دیا۔ مَیں نے بھی موقعہ غنیمت جان کر کہا کہ مَیں نے بھی دِل ہی دِل میں آپ کو بہت داد دی تھی۔ ایوا نے جواب دیا کہ مَیں نے بھی دل ہی دل میں آپ کو بوسہ دیدیا تھا۔

جب سیمنار ختم ہوا تو کسی کا دِل وہاں سے جانے کو نہیں تھا۔ دو ملکوں کے ادیبوں نے جو لمحے ایک دُوسرے کی محبّت اور رفاقت میں گزارے تھے، کوئی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ختم ہوں۔ لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اچھی چیزوں کی زندگی مختصر ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر مجھے بھی جمشید مسرور کی اُردو کے شاعر عدم کا ایک شعر سُنانے کی اجازت دیجئے:

ملاقاتیں مسلسل ہوں تو دلچسپی نہیں رہتی
یہ بے ترتیب یارانے حَسیں معلوم ہوتے ہیں

۴

آہستہ آہستہ اور بادلِ ناخواستہ ناروے کے ادیب ہال سے نکل گئے لیکن ایشیائی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر وہیں گپ شپ کرتے رہے۔ ویسے تو اب بھی سب لوگ ہم مہمان ادیبوں کے ساتھ خاصی محبت سے پیش آ رہے تھے لیکن ہمیں احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اب ہماری حالت ایسی ہی تھی جیسے ڈولی چلے جانے کے بعد باراتیوں کی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ پوچھ تو رہے تھے کہ آپ کو چائے یا کافی کی ضرورت ہو تو بتائیے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ آپ واپس کب جا رہے ہیں۔

ہرچمن چاولہ صاحب نے ہم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سمینار کے اختتام پر ہمیں فوراً نہیں جانے دیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم ناروے میں کچھ دن اور ٹھہریں اور اس خوبصورت ملک کے حسنِ دلفریب کا لطف اٹھائیں۔ اس عرصے میں ہم اُن کے ذاتی مہمان ہوں گے۔ پروفیسر انتھا مورتی تو نہیں مانے کہ انھیں اگلی صبح برلن یونیورسٹی میں حاضری دینا تھی، لیکن پروفیسر چوہدری اور میں فوراً رضامند ہو گئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دلّی میں آئے دِن ہونے والی ریلیوں میں

شریک ہونے والے ہریانہ اور پنجاب کے کسان بھی ریلی کے بعد دلی شہر کا ایک چکر لگائے بغیر واپس نہیں جاتے تو پھر ہم ہزاروں کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد صرف سمینار میں پیپر پڑھ کر کیسے لوٹ جاتے۔

ہال میں جب ہم گپ شپ کر رہے تھے تو اچانک ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے:

"مَیں سعید انجم ہوں۔"

سعید انجم اُردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں اور مَیں ان کے نام اور کام سے بخوبی واقف تھا۔ ہندستان سے روانہ ہونے سے پہلے مَیں نے ناروے میں جن ادیبوں سے ملنے کا پروگرام بنایا تھا اُن میں سعید انجم کا نام بھی تھا۔ لیکن سمینار کے دوران وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ جب مَیں نے شکایت کی کہ وہ اتنے دن کہاں رہے تو کہنے لگے کہ مَیں کچھ ذاتی کاموں میں مصروف تھا۔ اس وقت بھی صرف یہ کہنے کے لئے حاضر ہُوا ہوں کہ آپ کے ڈنمارک کے سفر میں آپ کی ڈرائیوری کا فرض مَیں نبھاؤں گا۔

اس بات کا تو مجھے علم تھا کہ نصر ملک چاہتا ہے کہ مَیں بذریعہ کار ڈنمارک جاؤں کہ راستے کا نظارہ دیدنی ہے۔ لیکن یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ دورانِ سفر میرے ہمراہ ایک ایسا شخص بھی ہوگا جس کے ساتھ وقت گزارنا باعثِ مسرّت ہوگا۔

طے یہ پایا کہ مَیں تین دن اور ناروے میں رہوں گا اور چوتھے دن سویرے سویرے سعید انجم مجھے چاولہ صاحب کے گھر سے لے جائیں گے۔

اس رات ڈنر نئی دلی ہوٹل میں تھا۔ یہ ہوٹل کپور تھلہ کے سردار گوردیال سنگھ چلا رہے ہیں۔ وہاں بہت سے سرکردہ ایشیائی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ ہوٹل کی ایک نارویجین ویٹرس جو ہماری خدمت پر مامور تھی، شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے مہمان کے کان میں اس کی دلفریبی کی تعریف کی تو وہ کہنے لگے کہ میں نے تو سُنا تھا کہ پنجابیوں کو عورتیں صرف اپنے حرم میں اچھی لگتی ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو شلوار قمیص میں بھی اچھی لگتی ہیں۔

رات ہم لوگ چاولہ صاحب کے گھر آگئے۔ انھوں نے چوہدری صاحب اور میرے لئے الگ الگ کمروں کا بندوبست کر رکھا تھا لیکن اب ہماری حالت یہ تھی کہ ہمیں الگ الگ رہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ہم ۲۵ر سے ۲۷ر مئی تک ناروے میں گھومتے رہے۔ ان تین دنوں میں دو دن تو اوسلو میں گزرے اور ایک دن اوسلو سے باہر۔ وہ غالباً ۲۶ر مئی کا دن تھا۔ لیکن میں اس دن کا ذکر بعد میں کروں گا، حالانکہ اس طرح تسلسل میں گڑبڑ ہو جائے گی۔

۲۵ر مئی کی صبح کو ہم لوگ ہندستانی سفارت خانے گئے کہ چوہدری صاحب کو اپنے پاسپورٹ کا ایک مسئلہ حل کرنا تھا۔ وہاں پہنچے تو سفارتخانے کے کئی افسر میرے واقف کار نکل آئے کہ میری زندگی وزارتِ خارجہ میں ہی گزری ہے۔ سفیر محترم کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں وہ کہنے لگے کہ کہانی لکھنی ہو تو اسٹینوگرافر کو لکھاتے میں زیادہ مشکل ہوتی ہے یا ہاتھ سے لکھنے میں۔ میں نے کہا " سر زیادہ مشکل تو اس وقت ہوتی ہے جب

کہانی ذہن میں لکھی جا رہی ہوتی ہے۔" اس پر ایک بھرپور قہقہہ پڑا۔ وہاں سے ہم چاولہ صاحب کے دفتر آ گئے۔

چاولہ صاحب ڈائک مانسکے بیلی اوٹیک DEICH MANSKE BIBLIOTEK میں کام کرتے ہیں۔ یہ ناروے کی سب سے بڑی لائبریری ہے اور دُنیا کی بڑی لائبریریوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی بڑی عمارت میں واقع ہے۔ لائبریری میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا ہے کہ آپ کتابوں کے ایک بہت بڑے محل میں داخل ہو گئے ہیں۔ تقریباً ہر زبان اور ہر مصنّف کی کتابیں اس لائبریری میں مَوجُود ہیں۔ میری بھی۔ چاولہ صاحب کے ذمّے اُردو، ہندی اور پنجابی کی کتابوں کی تلاش اور فراہمی ہے۔

جس کمرے میں اُن کا دفتر ہے وہاں کئی اور زبانوں کے ماہرین بھی بیٹھتے ہیں جن میں بہت سی لڑکیاں ہیں۔ چاولہ صاحب نے اپنی سہولت کے لئے انھیں دیسی نام دے رکھے ہیں۔ کسی کو سندری کہتے ہیں اور کسی کو پیاری۔ کسی کو شانتی اور کسی کو موہنی۔ وہ لڑکیاں نہ صِرف ان ناموں سے واقف ہیں بلکہ چاولہ صاحب سے بھی بہت مانوس ہیں۔ بزرگی کے کچھ فائدے ہیں جن کا چاولہ صاحب پُورا پُورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

مَیں زیادہ دیر فارسی زبان کے ایڈوائزر کے پاس بیٹھا رہا اور اس پر بی۔ اے میں پڑھی ہوئی اپنی فارسی آزماتا رہا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ۱۹۵۲ء میں چھوڑی ہوئی زبان کے لئے مَیں ابھی تک اجنبی نہیں بنا تھا۔ فارسی کا ایڈوائزر میری بات بخوبی سمجھ رہا تھا۔ چالاکی مَیں صرف اتنی کر رہا تھا کہ جس بات کی مَیں فارسی

نہیں بنا سکتا تھا وہ بات میں کہتا ہی نہیں تھا۔

اس لائبریری کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ ناروے کی سرکار اپنی ذمے داری سمجھتی ہے کہ ناروے میں آکر بس جانے والے تارکینِ وطن کم از کم اپنے ادب سے کٹ کر نہ رہیں۔ اس طرح ان لوگوں میں تنہائی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

لائبریری میں ایک نئی بات مجھے معلوم ہوئی۔ کوئی کتاب جتنی بار لائبریری سے مستعار لی جاتی ہے اس کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ مصنّف کو اس کے حساب سے رائلٹی ملتی ہے۔ ہمارے یہاں، جہاں مصنّف کو کتاب کی فروخت پر بھی رائلٹی دینے کا رواج نہیں ہے، وہاں پتہ نہیں لائبریری سے مستعار لی ہوئی کتابوں پر رائلٹی ملنا کب شروع ہوگا۔ ویسے اگر ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ میرے سمیت اردو کے تمام ادیب دن بھر لائبریریوں سے خود ہی اپنی کتابیں نکلواتے اور واپس کرتے رہیں گے تاکہ روٹی روزی کا ایک معقول ذریعہ بن جائے۔

چاولہ صاحب نے بتایا کہ کسی اخبار کا ایک نامہ نگار مجھے انٹرویو کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے میرا اس سے تعارف کروایا اور ہمیں لائبریری کے کینٹین میں بٹھا دیا۔ وہ خود چوہدری صاحب کے ساتھ شاید پھر ہندستانی سفارتخانے کی طرف نکل گئے۔

نامہ نگار مجھ سے انڈیا پرسپیکٹوز کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔ یہ وہ ماہنامہ ہے جس کا میں مدیرِ اعلیٰ ہوں اور جسے بھارت سرکار کی وزارتِ خارجہ دس زبانوں میں شائع کرتی ہے جس میں ایک اردو بھی ہے۔ نامہ نگار نے مجھے

بتایا کہ اس رسالے کے ذریعے ہمیں ہندستان کو سمجھنے میں مدد مل رہی ہے، ظاہر ہے یہ بات سن کر میری باچھیں کھل گئیں۔

اس کے بعد اس کے زیادہ سوال میرے اوائلِ زندگی کے بارے میں تھے جس نے بعد میں میری زندگی پر اثر ڈالا۔ وہ تو خیر شوق سے میرے جواب سن ہی رہا تھا لیکن خود مجھے اپنی عمر کے وہ سال یاد کر کے بڑا لطف آرہا تھا جو میں نے اپنے آبائی گاؤں رام کے چھٹہ ضلع گوجرانوالہ میں گزارے تھے۔ جب اُس نے میرے آبا و اجداد کے بارے میں پوچھا تو ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ غالبؔ کی طرح میں بھی اپنے بزرگوں کو فوج کے مختلف عہدوں پر سجادوں کہ وردی میں زیادہ پُر اثر لگیں گے۔ لیکن پھر مجھے احساس ہُوا کہ میرا قد و قامت میرے جھوٹ کی چغلی کھائے گا۔ چنانچہ میں نے صاف صاف بتادیا کہ میرے آبا و اجداد زمیندار تھے اور اس طرح ان کا دیش کی مٹی اور مٹی سے پیدا شدہ چیزوں سے گہرا سمبندھ تھا ـــ اتنا گہرا کہ آج بھی مجھے کسی خوبصورت، سرو قد، متناسب بدن کی لڑکی کے لئے جو تشبیہ سوجھتی ہے وہ عام طور پر کنوئیں کے پانی سے اُگی ہوئی مولی یا گاجر کی ہوتی ہے۔

جب تک میں نامہ نگار سے فارغ ہُوا، چاولہ اور چوہدری صاحب واپس لائبریری میں آگئے تھے۔ وہاں سے ہم تینوں ناروے ریڈیو اسٹیشن چلے گئے کہ وہاں ہمارا انٹرویو تھا۔

اپنے وطن میں ریڈیو پر انٹرویو دیتے اور لیتے میری عمر گزری ہے۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ پندرہ منٹ کے پروگرام کے لئے آپ کے کم از کم دو گھنٹے

صَرف ہوجاتے ہیں۔ کبھی اسٹوڈیو خالی نہیں ہوتا اور کبھی پروڈیوسر۔ لیکن یہ یورپ تھا۔ پروڈیوسر کے پاس پہنچتے ہی ہم تینوں کو اسٹوڈیو لے جایا گیا جہاں پہلے سے سب انتظام مکمل تھا۔ پروڈیوسر نے ہمیں بتایا کہ پروگرام سمینار سے مُتعلق ہے۔

بہتر انتظام کے علاوہ جو بات مجھے یہاں پسند آئی وہ انٹرویو کرنے والے کے سوال تھے۔ وہ سوال نہایت مختصر کرتا تھا اور ہمیں موقعہ دیتا تھا کہ ہم اپنے تأثرات کھُل کر بیان کرسکیں۔ مجھے دلّی میں ٹی وی پر اپنا ایک انٹرویو یاد آگیا۔

انٹرویو کرنے والے کا پہلا سوال کچھ اس طرح تھا:۔

"جب آپ نے سیریل "دِل دریا" لکھا تو آپ کے تحت الشعور میں یہ بات تھی کہ کہانی کے ذریعے اس اخوت، اس محبّت، اس بھائی چارے کو اُبھارا جائے جو ہندستان کے مختلف فرقوں میں آپس میں ہے۔ آپ نے اپنی کہانی کا تانا بانا اسی بات کو مدّ نظر رکھ کر بُنا۔ جب آپ "یہ دُنیا غضب کی" لکھ رہے تھے تو آپ اپنے سیریل میں اُن پریشانیوں کو ابھارنا چاہتے تھے جو ایک سادھارن آدمی کو ایک سرکاری دفتر میں پیش آتی ہیں۔ کیا جو کچھ مَیں نے کہا ٹھیک ہے؟"

مَیں نے کہا "ہاں"

اسی انداز میں وہ سوال پوچھتے رہے اور مَیں کبھی "ہاں" اور کبھی "نہ" میں جواب دیتا رہا۔ جب آدھے گھنٹے کا پروگرام ختم ہُوا تو پتہ چلا کہ ۲۷ منٹ

وہ بولتے رہے اور میں نے پانچ بار "ہاں" اور ایک بار "نہ" کہا۔

پروگرام کے بعد جمشید مسرور نے ہمیں اپنے چارج میں لے لیا کہ اس کے ذمے ہمیں اوسلو دکھانے کی ڈیوٹی تھی۔

جمشید نے پوچھا کہ آپ لوگ خصوصی طور پر کیا دیکھنا چاہیں گے۔ چونکہ اندرناتھ چوہدری اور میں نے دُنیا کے کئی مُلک دیکھ رکھے ہیں اس لئے ہم نے جواب دیا کہ یار میوزیم وغیرہ تو ہم نے بہت دیکھ رکھے ہیں، ہمیں کوئی ایسی چیز دکھاؤ جو ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ جمشید کہنے لگا کہ چلو پھر "نیوڈ بیچ" پر چلتے ہیں۔ نیوڈ بیچ سمندر کے کنارے ایک ایسا مقام ہے جہاں لوگ دھوپ کے موسم میں مادرزاد لباس میں گھنٹوں پڑے پڑے اپنے جسم کے ہر حصّے کو دھوپ سے ہمکنار کرتے ہیں۔ چوہدری صاحب نے تو ہمیں ڈانٹ دیا کہ ایسی جگہ بالکل نہیں جاؤں گا اور نہ ہی تم دونوں کو جانے دوں گا۔ لیکن ہم کہ ٹھہرے غیر ذمہ دار شخص، بضد تھے کہ وہاں ضرور جائیں گے۔ چوہدری صاحب ہم دونوں کو ایسی خطرناک جگہ تنہا کیسے جانے دیتے، چنانچہ ہمارے ساتھ ہو لئے۔

چوہدری صاحب کا اعتراض اپنی جگہ، لیکن نیوڈ بیچ دیکھنے کا مقام ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد، عورتیں اور بچے مادرزاد لباس میں دھوپ میں لیٹے ہوئے یا تو کتابیں پڑھ رہے تھے یا آنکھیں بند کئے چُپ چاپ پڑے تھے۔ بہت سے لوگ پوری فیملی کے ساتھ تھے یعنی خاوند، بیوی اور بچہ۔ ہزاروں لوگوں کو بے لباس دیکھ کر ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل میں ایسے خیالات بیدار نہیں ہوئے جو اچھے نہیں سمجھے جاتے۔ اگر کچھ بُرا لگ رہا تھا تو وہ ہمارا

اپنا لباس تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ہم بھی کپڑے اتار کر ان لوگوں میں شامل ہو جائیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ لوگ اس لباس میں ملبوس تھے جو قدرت نے ہمارے لئے متعین کیا ہے اور ہم لوگ مصنوعی لباس پہنے ہوئے تھے۔

وہاں سے نکلے تو ہم لوگ تل نل یوال گا تھے میں واقع فراگنز پارک میں آ گئے۔ یہ ایک وسیع پارک ہے جہاں لوگ سیر کے لئے آتے ہیں لیکن اس پارک کی شہرت کی ایک خصوصی وجہ یہ ہے کہ اس کے صدر دروازے سے لے کر اس کے اندرونی مینار تک ننگے مرد، ننگی عورتیں اور بچّے دکھائے گئے ہیں۔ بہت سے مجسّمے ایسے بھی ہیں جن میں مرد و زن کا اختلاط دکھایا گیا ہے۔ ان مجسّموں کا خالق گستود گیلان ایک عظیم بُت ساز مانا جاتا ہے۔

گستود گیلان کے بارے میں مَیں کسی قسم کی رائے دینے کا اہل نہیں ہوں کہ اس پارک کا وجود ہی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ناروے کے لوگ اسے عظیم مانتے ہیں لیکن سچّی بات یہ ہے کہ بہت سے مجسّمے مجھے ایسے لگے جو انسان کے اندر جنسی جذبات اُبھارتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس طرح کے مجسّمے کھجراہو اور کونارک کے مندروں میں موجود ہیں لیکن مجھ نااہل کی سمجھ بوجھ کے مطابق وہ ناروے کے مجسّموں سے کہیں زیادہ آرٹسٹک ہیں۔

حالانکہ ہم لوگ فیصلہ کر چکے تھے کہ کوئی بھی میوزیم نہیں دیکھیں گے لیکن مسز چاولہ کے اصرار پر ہم لوگ منک میوزیم دیکھنے چلے گئے۔ گئے تو اس طرح تھے جیسے کوئی ننھا سا بچّہ پہلی بار اسکول جاتا ہے۔ لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ اگر نہ دیکھتے تو شاید ناروے کا سفر نامکمّل رہتا۔ میرے علم کے مُطابق ایڈوارڈ منک واحد مصوّر

ہے جن کی تصویروں کی نمائش کے لئے ایک پورا میوزیم وقف کیا گیا ہے۔

بے پناہ شہرت حاصل کرنے کے بعد ایڈوارڈ منک ۱۹۴۴ء میں ۸۱ سال کی عمر پا کر فوت ہُوا۔ جب اس کی وصیت پڑھی گئی تو پتہ چلا کہ وہ اپنی شاہکار تصویریں اوسلو شہر کو تحفے میں دے گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں ایک میوزیم بنایا گیا تاکہ منک کی تصویروں کو نہ صرف بحفاظت رکھا جائے بلکہ ان کی نمائش کی جا سکے۔ اس میوزیم میں منک کی ایک ہزار پینٹنگز، ساڑھے چار سو اسکیچز اور اٹھارہ ہزار عکسی تصویریں موجود ہیں۔ یہ تصویریں نہ صرف منک کا سوانحی خاکہ پیش کرتی ہیں بلکہ مصوّر نے تقریباً تمام انسانی جذبات جیسے ماں بچے کی محبت، عاشق کی معشوق سے الفت، ہجر و وصال کے لمحات وغیرہ کو اپنی مصوّری کا موضوع بنایا ہے۔

حالانکہ مصوّری کے بارے میں میرا علم ایسا تو نہیں ہے کہ میں ایک عظیم آرٹسٹ کے فن کا تجزیہ کر سکوں لیکن اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ایڈوارڈ منک کی تصویروں میں ایک عجیب سی کشش ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس میوزیم کی تصویروں کو گھنٹوں دیکھتے رہیں۔

جمشید مسرور کی کار میں سفر کرتے ہوئے ہم اوسلو کے ایک علاقے سے گزرے جہاں بہت سی دکانیں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی تھیں۔ ان دکانوں کے گاہک بھی ہمارے ہی بھائی بند تھے کیونکہ بہت سے بورڈ اُردو میں لکھے ہوئے نظر آئے۔ دو بورڈ پڑھ کر مجھے بہت لُطف آیا۔ یہ دونوں بورڈ حجامت کی دُکانوں پر تھے۔ ایک پر لکھا تھا:

"یہاں پاکستانی طرز کے بال بنائے جاتے ہیں۔"

دوسری پر لکھا تھا:

"یہاں ہندستانی طرز کے بال بنائے جاتے ہیں۔"

بال بھی پاکستانی اور ہندستانی طرز کے ہوتے ہیں یہ مجھے اُسی دن معلوم ہُوا۔ اس پر مجھے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ میَں ان دنوں صومالیہ میں ہندستانی سفارت خانے میں تعینات تھا۔ میرا ایک پاکستانی دوست لاہور سے شادی کر کے آیا تو باتوں باتوں میں میَں نے اس کی بیوی سے پوچھا:

"کیا آپ کو کھانا بنانا آتا ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"ہاں کچھ پاکستانی کھانے بنا لیتی ہوں۔"

مجھے بڑی ہنسی آئی۔ مُلک کیا تقسیم ہوا' ہمارے کھانے' ہمارا لباس، ہمارا رہن سہن تقسیم ہو گیا۔ لیکن ناروے آکر مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارا بال بال بٹ چکا ہے۔

ان دو دنوں میں ڈنر کے لئے ہم مینا گروور اور سجاتا پربھو کے مہمان تھے۔ سجاتا پربھو انگریزی میں شاعری کرتی ہے۔ سجاتا کے خاوند اپنے دفتر کے کام کے سلسلے میں اوسلو سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ صرف اس ڈنر کے سلسلے میں کئی گھنٹے گاڑی چلا کر شام کو آئے اور پھر اگلی صبح واپس گئے۔ اس خاندان کی یہ محبت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

ہماری دوسری میزبان مینا گروور کو ہندستانی موسیقی سے بہت محبت ہے۔ سمینار کا آغاز اسی کے ستار وادن سے ہوا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہندستانی

موسیقی اور رقص کا ایک اسکول چلاتی ہے۔

ڈنر بہت پرتکلف تھا اور ماحول بہت خوشگوار۔ اس کے گھر پتہ نہیں کس طرح سکھوں اور پٹھانوں کے لطیفوں کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ کچھ لوگ پٹھانوں کے لطیفے سُنانے لگے اور کچھ سکھوں کے۔ مَیں اس گروپ میں تھا جو پٹھانوں کے لطیفے سنا رہا تھا، لیکن جیت دُوسرے گروپ کی ہوئی۔ کیوں کہ کچھ دیر کے بعد مَیں خود اُن کا ساتھ دینے لگا۔

"چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

۵

جی مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۶ رمئی کو ناروے میں گزارے ہوئے دن کی روداد ابھی میرے ذمے ہے۔

اوسلو کے مغرب میں قریب ۳۵ رکلومیٹر کی دوری پر ایک خوبصورت شہر ہے درامن۔ طے یہ ہوا کہ ہم ۲۶ رمئی کو اس شہر کی سیر کو چلیں گے۔ چنانچہ ناشتے کے بعد چاولہ صاحب، اندر ناتھ چوہدری اور آپ کا یہ داستان گو جمشید مسرور کی کار میں سوار ہو کر درامن کی طرف چل دیئے۔

درامن کے سفر کا پروگرام اس لئے بنایا گیا کہ ایک تو یہ چھوٹا سا شہر ناروے کا نہایت ہی خوبصورت شہر مانا جاتا ہے، اور دُوسرے یہ کہ یہاں سے تھوڑا آگے جائیں تو سمندر کے کنارے ایک جگہ ہے جسے نارویجین زبان میں VERDENS ENDE کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے دُنیا کا آخری کنارہ۔ کہا جاتا ہے کہ ہماری زمین اس مقام پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ ناروے آنے والا ہر سیّاح اس مقام پر ضرور آتا ہے کہ اس طرح اُسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے پُوری دُنیا کی سیر کر لی۔

درامن کا سفر میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے کیونکہ اسی سفر کے دوران میری ملاقات ایک غیر معمولی انسان سے ہوئی۔ نام تھا اُس کا بنارسی داس۔

بنارسی داس درامن کا سرکردہ ہندستانی ہے۔ وہ ناروے میں مُنتقل ہونے سے پہلے پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کا باشندہ تھا۔ وہ فخر سے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جسے عام لوگ اچھوت اور گاندھی جی ہریجن کہتے تھے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اس طبقے کے لوگ ہمارے مُلک میں بے شمار ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے دِل کو سمجھا لیا ہے کہ پچھلے جنم میں اُن کے کرم ایسے تھے جن کی وجہ سے ان کی موجودہ زندگی کی ذلت برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ وہ شرافت سے' اونچی ذات والوں کے غلیظ ترین کام اپنے ذمّے لے لیتے ہیں اور اس دُنیا کی راہوں پر اس احتیاط سے چلتے ہیں کہ ان کا ناپاک سایہ کسی اونچی ذات والے کے بدن کو چھُو تک نہ سکے۔

اُن کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے احساس ہے کہ سوسائیٹی نے اُن کے متعلق اپنا رویّہ بدل لیا ہے۔ چنانچہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ آئین میں جو سہولتیں اُن کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے موجود ہیں، اُن کا پُورا پُورا فائدہ اٹھا کر وہ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھیں۔ بنارسی داس ان دونوں طبقوں سے الگ تھلگ ہے۔ پہلے طبقے سے اس طرح مُختلف ہے کہ بچپن سے ہی اسے احساس تھا کہ ایک اچھوت کے گھر میں اس کی پیدائش محض ایک حادثہ ہے اور اس

پر اس حادثے کی کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس نے کبھی وہ ظلم برداشت کرنا ضروری نہیں سمجھا جو سوسائٹی نے اس پر عائد کر رکھا تھا۔ بنارسی داس جب اسکول میں پڑھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ "اونچی ذات" کے لڑکے تو بنچ پہ بیٹھتے تھے اور ہریجن ٹاٹ پر۔ بنارسی داس نے اس تقسیم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی ضد تھی کہ وہ بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ بنچ پر بیٹھے گا۔ اسکول سے لے کر کالج کی تعلیم مکمل کرنے تک اُس نے کبھی کسی ناانصافی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ اِس سلسلے میں اگر ایجی ٹیشن کرنے کی ضرورت پڑی تو ایجی ٹیشن کی۔ ہڑتال کی ضرورت پڑی تو ہڑتال کی۔ بحث سے کام چلا تو بحث کی لیکن ناانصافی سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

بنارسی داس نے اپنے فرقے کے دُوسرے طبقے کا رویّہ اپنانے سے بھی انکار کر دیا۔ ہمارے آئین میں ہریجنوں کے ساتھ سالہا سال کی بے انصافی کے کفّارے کے طور پر اُن کو کچھ رعایات دی گئی ہیں جن پر یقیناً ان کا حق ہے لیکن بنارسی داس کو یہ گوارا نہ ہُوا کہ ان مراعات کا فائدہ اُٹھائے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب مجھے ہریجن گھر میں پیدا ہونے کی ذلّت سے سمجھوتہ منظور نہیں تو پھر میں یہ کیسے منظور کر لوں کہ اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنی پیدائش کے حادثے کو اپنے کوائف میں شمار کر لوں۔ چنانچہ زندگی کی جدّوجہد اس نے اپنے بل بوتے پر کی۔ وہ وطن سے ہجرت کر کے ناروے چلا آیا۔ یہاں بے حد محنت کے بعد اس نے اپنی زندگی میں رنگ بھرے۔ اس کا درامن میں بہت ہی اچھا کاروبار ہے۔ ایک نہایت ہی کشادہ آرام دہ گھر ہے۔ اس کے بچے

بہترین تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ہم جیسے "اونچی" ذات کے لوگ فخر سے اُس کے دسترخوان پر بیٹھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

دراصل میں ہم لوگ بنارسی داس کی کار میں منتقل ہو گئے اور وہ ہمیں دُنیا کے آخری کنارے کی طرف لے گیا۔

راستہ بہت ہی جاذب نظر تھا۔ گاڑی میں بہت سے کیسٹ رکھے تھے جنھیں بنارسی داس ہماری تفریح کے لئے بجا رہا تھا۔ میرے اصرار پر بنارسی داس نے جگجیت سنگھ کا ایک کیسٹ بجایا جسے سُن کر جمشید مسرور نے کہا کہ جگجیت کے گیت میں اتنی مُرکیاں نہیں ہیں جتنی مہدی حسن کے گیت میں ہوتی ہیں۔ اُس کی فرمائش پر بنارسی داس نے مہدی حسن کی ایک غزل لگا دی جسے سُن کر مَیں نے کہا کہ مہدی حسن بے شمار مرکیوں کی مدد سے جو کیفیت پیدا کر رہا ہے وہ جگجیت کی سیدھی سادی آواز میں ہے۔ اس پر کار میں بیٹھے ہمارے ساتھیوں کا ایک قہقہہ بُلند ہُوا جس سے مجھے اور جمشید مسرور کو احساس ہوا کہ ہم لوگ سنگیت نہیں سُن رہے، فرضی حبّ الوطنی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

دُنیا کا آخری کنارہ مجھے بہت بھایا۔ سمندر کے بیچوں بیچ بہت سے پہاڑی ٹیلے تھے جن پر ہم لوگ بہت دیر تک گھومتے رہے اور تصویریں کھچواتے رہے تاکہ اس بات کی سند رہے کہ ہم نے پوری دُنیا کا چکّر لگا لیا ہے۔ اس جگہ پر ایسا سکوت چھایا ہوا تھا کہ جس پر تقریر بھی فدا ہو۔

مَیں نے جب بنارسی داس سے کہا کہ مجھے دُنیا کا آخری کنارہ اچھا لگا ہے تو کہنے لگا کہ ایسا ایک دوسرا مقام بھی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کو وہ بھی دِکھا

دیں گے۔ اس پر بحث چھڑ گئی کہ دُنیا کے سارے آخری کنارے ناروے میں کہاں سے آگئے۔ جمشید مسرور کا کہنا تھا کہ دُنیا کا آخری کنارہ بس یہی ہے اور بنارسی داس بضد تھا کہ مَیں ایسے کم از کم دو اور کنارے دکھا سکتا ہوں۔ جمشید مسرور نے کہا کہ اس سمندر کے بعد زمین کا نشان تک نہیں ہے لیکن بنارسی داس کا کہنا تھا کہ کہ سمندر کا کنارہ کسی زمین سے ضرور جا لگتا ہو گا۔ جب جمشید مسرور نے کہا کہ پھر یہ بورڈ یہاں کیوں لٹکایا گیا ہے کہ یہ زمین کا آخری کنارہ ہے تو بنارسی داس نے جواب دیا کہ ناروے کے لوگوں کا جو تخیّل اس دُنیا کے بارے میں ہے وہ یہاں تک اُڑان بھرنے کے بعد ختم ہو گیا۔

ہر بحث کی طرح یہ بحث بھی کسی فیصلہ کُن حد تک نہ پہنچ سکی۔ ویسے دیکھا جائے تو دونوں کا کہنا صحیح تھا۔ ہم سب کی زندگی میں کئی ایسے مقام آتے ہیں جب لگتا ہے کہ ہمارا آخری پڑاؤ آگیا لیکن باہمّت لوگ وہاں سے بھی آگے گزر جاتے ہیں کہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست۔

اس دلفریب جگہ سے لوٹنے کو کسی کا جی نہیں چاہتا تھا لیکن بہر حال لوٹنا تھا۔ چنانچہ ہم سب لوگ بادِل ناخواستہ اُٹھے اور درامن کی طرف چل دیئے۔ درامن میں اونچائی پر ایک جگہ ہے جہاں سے یہ شہر پورے کا پورا دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ دیر اس نظارے کا لُطف لینے کے بعد ہم سب لوگ بنارسی داس کے گھر کی طرف چل دیئے کہ ہمیں ڈنر ان کے ہاں لینا تھا۔

ڈنر سے پہلے بنارسی داس ہمیں اپنے گھر کی پہلی منزل پر لے گیا اور دعوتِ ناؤ نوش دی۔ بنارسی داس کو شراب کی لت نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو پلا کر سمجھتا

ہے کہ اس نے اپنے مہمانوں پر اپنی امارت کا رعب ڈال دیا ہے لیکن اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ مہمان نوازی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہے۔ اس وجہ سے ایک بڑی مضحکہ خیز صورت پیدا ہوگئی۔ ہم سب اس لئے پی رہے تھے کہ کہیں وہ ہمارے انکار کا بُرا نہ مان جائے۔ اس چکر میں اس نے خود بھی پی حالانکہ اُسے یہ شے بالکل پسند نہیں ہے۔ اور مَیں نے بھی پی حالانکہ میرے ڈاکٹر نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ چنانچہ جب مَیں نے گلاس اپنے ہاتھ میں تھاما تو جیب میں رکھی ہوئی دوائیوں کی شیشی پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

گپ شپ کے دوران گفتگو کا رُخ پھر ہندستان کے ہریجنوں کی طرف مُڑ گیا۔ جمشید مسرور کو بنارسی داس سے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ہندستان میں ہریجنوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کئی قدم اُٹھائے گئے ہیں۔ اور خود عوام کا رویّہ اُن کے متعلق دِن بدن بدل رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ منو مہاراج ہندو سوسائٹی کو جس حال میں چھوڑ گئے تھے وہ وہیں پر اٹکی ہوئی ہے۔ جب مَیں نے اُسے بتایا کہ ناروے میں مقیم ہندستان کے موجودہ سفیر اسی طبقے سے ہیں تو مجھے لگا جیسے اُسے بنارسی داس کی بات کا کامل یقین ہوگیا ہو۔

بنارسی داس کی باتیں سُن کر مجھے یہ خیال ہُوا کہ حالانکہ اس نے محنت اور مشقّت سے اپنی زندگی اُن تمام ذلتوں سے پاک کر لی ہے جو اس کی پیدائش کے حادثے نے اس پر مسلّط کر دی تھیں لیکن ان دنوں کی تلخ یادوں سے وہ ابھی تک نجات نہیں پا سکا۔ سچّی بات یہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام بھی نہیں۔

خالص ہندستانی اور پیار بھرے ماحول میں ایک لذیذ ڈنر کھانے کے بعد

ہم لوگ اوسلو کی طرف چل دیئے۔ دِل میں وہی احساس تھا جو ایک اچھے ماحول میں ایک دن گزارنے کے بعد کئی دِن رہتا ہے۔

چاولہ صاحب کے گھر پہنچے تو سعید انجم کا فون آیا کہ اگلی صبح وہ مجھے چاولہ صاحب کے گھر سے، پہلے اپنے گھر لے جائے گا اور پھر پروگرام کے مطابق ہم لوگ ڈنمارک کی طرف چل پڑیں گے۔

صبح اُٹھ کر مَیں اور اندر ناتھ چوہدری صاحب رختِ سفر باندھنے لگے۔ چوہدری صاحب کو اُسی دن دلّی کے لئے روانہ ہونا تھا۔

سعید انجم کے پہنچنے سے پہلے جمشید مسرور اور اُن کی اہلیہ روبینہ الوداع کہنے کے لئے تشریف لائے اور ہمیں تحائف سے نوازا۔ اس تحفے سے کہیں زیادہ قیمتی تحفہ تو اُن کی محبت تھی جو مجھے زندگی بھر مسرور رکھے گی۔

کچھ دیر بعد سعید انجم مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں بٹھا کر وہ کچھ گھنٹوں کے لئے اپنی ڈیوٹی نبھانے اس اسکول میں چلا گیا جہاں وہ ڈراما پڑھاتا ہے۔ یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہے کہ افسانہ نگاری کے علاوہ سعید انجم ایک فلم ساز بھی ہے۔ اور اس کی ایک فلم دُنیا کے کئی ملکوں میں دکھائی جا چُکی ہے اور بہت سے انعامات حاصل کر چکی ہے۔

سعید چلا گیا تو مَیں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس کے افسانوں کا مجموعہ "سب اچھا ہوگا" پڑھ لیا۔ اس مجموعے کی کئی کہانیاں مَیں ڈاکٹر محمد حسن کے پرچے "عصری ادب" میں پڑھ چُکا تھا۔ کچھ کہانیاں کراچی کے "افکار" میں پڑھ چکا تھا لیکن مجموعہ پڑھ کر مجھے اس کی تخلیقی قوّت کا بھرپور اندازہ ہوگیا۔ کہانیوں سے زیادہ

دلچسپی سے میں نے اس کی کتاب کا دیباچہ پڑھا جس میں اس نے اپنا تعارف خاصی تفصیل سے دیا ہے۔

یہ دیباچہ پڑھ کر میں نے اپنے ذہن میں اس کی شخصیت کا ایک عکس تیار کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی شخص کے ساتھ لمبے سفر پر جانا ہو تو اُسے پہلے سے اچھی طرح جان لینا چاہیئے ورنہ ایک دوسرے کو سمجھنے میں خاصا وقت نکل جاتا ہے اور کام کی کوئی دوسری بات نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ دیباچہ پڑھ کر اور اُسے جان لینے کے بعد میں اب اس سے ایک تفصیلی ملاقات کے لئے تیار تھا۔

۶

سعید انجم کا خیال تھا کہ وہ اپنے اسکول سے دو گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔ لیکن وقت زیادہ لگ گیا۔ چنانچہ اس کے افسانوں کا مجموعہ پڑھنے کے بعد ایک بار پھر مَیں نے اس کی لائبریری کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے ایک کتاب نظر آئی "شہاب نامہ"۔ مَیں اس کتاب کے بارے میں سُن تو چکا تھا لیکن دیکھی نہیں تھی۔ یہ کتاب پاکستان کے ایک سینئر بیورو کریٹ اور افسانہ نگار قدرت اللہ شہابؔ صاحب کی داستانِ حیات ہے۔ شہاب صاحب پاکستان میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو پاکستان میں ہونے والے ایسے بہت سے واقعات کا پس منظر معلوم ہوگا جن کے بارے میں ہم جیسے لوگ محض اندازے لگا سکتے ہیں۔ انھوں نے خود اسی کتاب کے دیباچے میں حفیظؔ جالندھری صاحب کا مندرجہ ذیل شعر درج کیا ہے:

جب کہیں انقلاب ہوتا ہے
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ بقول حفیظ "وطن عزیز

میں انقلاب کی آڑ میں جتنی غیر جمہوری کارروائیاں ہوتی رہی ہیں اُن سب میں میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ تھا۔" مجھے یقین تھا کہ ایسے شخص کے تجربات کا مطالعہ دلچسپ ہوگا۔ چنانچہ میں نے کتاب اُٹھالی۔

یہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں تقریباً ساڑھے بارہ سو صفحے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر سعید انجم مجھے پورا دن بھی اپنے گھر میں چھوڑ جاتا تو میں اس کتاب کو پوری طرح پڑھ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ مختصر سے وقت میں اس کو کم از کم اس طرح دیکھ لوں جیسے ہمارے تبصرہ نگار تبصرہ لکھنے سے پہلے کسی کتاب کو دیکھتے ہیں۔

اس مختصر وقت میں میں کتاب کے کم از کم سو صفحے پڑھ گیا۔ ان سب سے تو شاید آپ کو دلچسپی نہ ہو لیکن کم از کم ایک واقعہ میں اپنے قارئین کو ضرور سُنانا چاہوں گا، لیکن اس سے پہلے ایک بات "شہاب نامہ" کے دیباچے سے:

"ملازمت کے دوران میں نے اپنا کام ایمانداری اور بے خوفی سے کیا۔ اس کی پاداش میں چار بار استعفیٰ دینے کی نوبت آئی۔"

اب وہ واقعہ سُنیئے لیکن پہلے اس واقعہ کا پس منظر۔

قدرت اللہ شہاب جب آئی سی ایس کے امتحان میں کامیاب ہوئے تو ہندستان میں تھے۔ کچھ سال یہیں ملازمت کی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد وہ وہاں ہجرت کر گئے۔ ہندستان کی ملازمت کے دوران میں وہ اپریل ۱۹۴۷ء میں اُڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سکریٹری تھے۔

اب وہ واقعہ اُن کی زبانی سُنیئے:

" اڑیسہ کے چیف منسٹر شری ہری کرشن مہتاب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ایک بار دہلی سے وہ کانگریس کی کسی میٹنگ سے واپس آئے تو اپنے معمول کے مُطابق انھوں نے کاغذات کی ایک صندوقچی میرے حوالے کر دی۔ ہمارا طریقہ کار یہ تھا کہ سیاسی کاغذات چھانٹ کر میں اُن کے پرسنل پرائیویٹ سکریٹری کے سُپرد کر دیتا تھا اور سرکاری کاغذات متعلقہ محکموں کو بھیج دیتا تھا۔ اُن کا پرسنل پرائیویٹ سکریٹری بڑا متعصب ہندو تھا۔ وہ اکثر اس بات پر سر پیٹتا تھا کہ مہتاب صاحب کے سیاسی کاغذات میرے ہاتھ سے کیوں گزرتے ہیں . . . . .

اس بار جو میں نے چیف منسٹر کے کاغذات کا جائزہ لیا تو اُن میں ایک عجیب دستاویز ہاتھ آئی۔ یہ چھ سات صفحات کا سائیکلو اسٹائلڈ انتہائی خفیہ SECRET حکم نامہ تھا جو کانگریسی چیف منسٹروں کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ ہر چیف منسٹر اسے اپنی ذاتی تحویل میں رکھے۔ اس میں لکھا تھا کہ تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چُکا ہے۔ اس لئے جن صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہیں وہاں مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے . . . .

یہ حکم نامہ پڑھ کر مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔ مہاتما گاندھی کی نام نہاد بے تعصبی کی لنگوٹی بادِ مخالف کے جھونکوں میں اُڑ کر دور جا پڑی اور

وہ اپنے اصلی رنگ وروغن میں بالکل برہنہ ہو گئے۔ اہنسا پرم دھرم کے اس جھوٹے پجاری کے اشاروں پر ناچنے والی انڈین نیشنل کانگریس کے عزائم اتنے ہی خطرناک اور سنگین نکلے، جتنے کہ ہندو مہا سبھا یا راشٹریہ سیوک سنگھ کے سمجھے جاتے تھے......

یہ دستاویز پڑھ کر تھوڑی دیر میرے دل میں ایک عجیب سی کشمکش ہوتی رہی۔ ڈپٹی ہوم سکریٹری کا پیشہ ورانہ ضمیر میرے اندر چھپے ہوئے بے عمل، ناقص اور خوابیدہ مسلمان کے ضمیر کے ساتھ ٹکرا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تھوڑی سی لڑائی کے بعد جیت ٹوٹے پھوٹے مسلمان کی ہی ہوئی۔ چنانچہ میں نے یہ دستاویز اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی اور اسی رات قائدِ اعظم سے ملاقات کرنے کی نیت سے بمبئی روانہ ہو گیا۔"

جب شہاب صاحب نے یہ دستاویز قائدِ اعظم کو پیش کی تو انھوں نے پوچھا:

"یہ تم نے کہاں سے حاصل کی؟"

میں نے فر فر ساری بات سنا دی۔

"وَیل، وَیل، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

THIS IS BREACH OF TRUST

اور پھر جب قدرت اللہ شہاب صاحب قائدِ اعظم کے کمرے سے نکل رہے تھے تو قائدِ اعظم نے کہا:

"بوائے! دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔"

میں نے یہ قدرے لمبا اقتباس اس لئے یہاں درج کیا کہ اس سے قائدِ اعظم کی عظمت اور اصول پرستی اور ایک ایسے سِول سرونٹ کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کا دعوٰے ہے کہ "ملازمت کے دوران میں نے اپنا کام ایمانداری اور بے خوفی سے کیا اور اس کی پاداش میں چار بار استعفٰے دینے کی نوبت آئی۔" میرے خیال میں انھیں ہری کرشن مہتاب صاحب کے بیگ سے کاغذ چرا کر قائدِ اعظم کے پاس لے جانے سے پہلے بھی استعفٰے دے دینا چاہیئے تھا۔ لیکن بار بار استعفٰے دینے والے سرکاری ملازم بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ اس وقت کبھی استعفٰے نہیں دیتے جب انھیں خدشہ ہو کہ شاید اسے منظور کر لیا جائے۔

سعید انجم اسکول سے لَوٹا تو ہم ڈنمارک کی جانب روانہ ہو گئے۔

یورپ کی سڑکوں پر کار میں سفر کرنے کا لُطف یہ ہے کہ منزل پر پہنچنے کی خواہش اتنی شدید نہیں ہوتی جتنی اپنے ہاں ہوتی ہے۔ مجھے تو بالکل نہیں تھی۔ کُشادہ سڑکیں، دلآویز نظارے اور آلودگی سے پاک فضا۔ اس پر طرّہ یہ کہ سعید انجم کا ساتھ تھا۔ سعید ایک منجھا ہوا سمجھدار اور مکمل طور پر غیر مُتعصب انسان ہے۔ سفر کے دوران میں مجھے اس میں کوئی ایسا عنصر نظر نہ آیا جس سے احساس ہو کہ ہم دونوں دو ایسے ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں جو آئے دِن ایک دُوسرے سے اُلجھتے رہتے ہیں۔

اس کی دو باتوں سے میں بے حد متأثر ہُوا۔ ایک تو یہ کہ وہ دُوسرے کی بات سُننے کو نہ صرف تیار رہتا ہے بلکہ اگر اُسے اس کی گفتگو میں عقل کی کوئی بات نظر آئے تو اس کے ساتھ اتّفاق کرنے میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتا۔

مجھے یاد ہے ہماری گفتگو کے دوران میں اس کے ایک افسانے کا ذکر آیا تو اس نے کہا کہ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ مَیں نے یہ افسانہ صدر ضیاء الحق کے عہد میں شائع کروایا تھا۔ مَیں نے کہا بھائی مَیں تو تمہیں ایک اچھے افسانے پر داد دے رہا تھا لیکن تم شاید اپنی جرأت کی داد چاہتے ہو۔ یہ سُنتے ہی سعید بہت کھُل کر ہنسا اور کہنے لگا:

"آج کے بعد میری اس جرأت کا ذکر میرے افسانے کے ساتھ نہیں ہوگا۔"

سعید انجم کی دوسری خوبی جس نے مجھے متأثر کیا، وہ اس کا دوسروں کی نیک نیتی پر اعتماد تھا۔ اس کی مثال کچھ دیر بعد پیش کروں گا کہ کئی باتیں مناسب وقت پر زیادہ اثر کرتی ہیں۔

ناروے سے ڈنمارک جائیں تو راستے میں آپ کو سمندر میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپ سویڈن کے بارڈر پر جہاز میں سوار ہوتے ہیں اور جب اُترتے ہیں تو آپ ڈنمارک میں ہوتے ہیں۔ کیا تو ہم نے بھی ایسا ہی لیکن یقین اب بھی نہیں آتا کہ ہمارے سفر میں سمندر کا سفر بھی شامل تھا۔ ہم کار سمیت جہاز میں داخل ہوئے۔ کار کو پارک کیا اور ایک ریسٹوران میں جا کر بیٹھ گئے۔ جہاز رُکا تو ہم نے اپنی کار اُٹھائی اور اپنے آپ کو اس سڑک پر پایا جو ڈنمارک جا رہی تھی۔

جب سڑک پہ آگئے تو شام کے قریب آٹھ بج رہے تھے۔ سعید کہنے لگا کہ ایک گھنٹے میں ہم نصر ملک کے ساتھ اس کی محبت کا لُطف اُٹھا رہے ہوں گے۔ نصر نے ابھی دنوں گھر بدلا تھا۔ سعید نے چلنے سے پہلے اس کے گھر کا راستہ

اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ بتائی ہوئی راہوں پر گاڑی چلا رہا تھا لیکن منزلِ مقصود ہمارے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ نصر کے نئے مکان میں فون نہیں تھا لیکن نصر کے ایک دوست علی صفدر کا فون نمبر سعید کو معلوم تھا۔ وہاں فون کیا تو معلوم ہوُا کہ وہ نصر کے گھر ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہے ہیں۔ اب تک ڈنمارک میں گاڑی چلاتے چلاتے ہمیں تین گھنٹے ہو چکے تھے۔

یورپ میں ایک تو لوگ ہیں بہت کم اور دُوسرے سب کے پاس گھر ہیں جن کی وجہ سے آدھی رات کو سڑکوں پر کوئی نہیں ملتا۔ راستہ پوچھیں تو کس سے؟ اور اس پر طرّہ یہ کہ سعید سمجھتا تھا کہ وہ ٹھیک راستے پر جا رہا ہے۔ اس چکر میں ہم لوگ آدھی رات کو پیچھے چھوڑ آئے۔ جس گھر میں بھی روشنی نظر آتی، سعید اُس کی طرف چل پڑتا کہ دیکھئے یہ نصر کا مکان ہے جو اتنی رات گئے ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہا ہے۔ ابھی ابھی جب میں نے کہا تھا کہ دوسروں کی نیک نیتی پر اس کا اعتماد بہت گہرا ہے، تو یہی بات میرے ذہن میں تھی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ نصر ملک اور اس کے دوست عجیب لوگ ہیں کہ انھیں ذرا بھی فکر نہیں کہ ہم کہاں ہیں اور سعید سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہے ہیں۔ حالانکہ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ لوگ اپنے گھر کی آرام دہ فضا میں بیٹھے بیُر سے جی بہلا رہے تھے۔

اس وقت سوال ہمارے سامنے یہ تھا کہ نصر کا گھر کیسے تلاش کیا جائے۔ سڑک پر جو ایک آدھ آدمی ہمیں نظر آیا وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اُس سے راستہ کیا پوچھتے۔ اس کو تو خود خضرِ راہ کی تلاش تھی۔

جب ہم ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک کر چور ہو گئے تو یورپ کی اس فورس کی طرف رجوع کیا جو وہاں سب سے زیادہ مددگار اور ہمارے ہاں سب سے زیادہ پریشانی کا کارن بنتی ہے۔ سعید نے جاتی ہوئی ایک پولیس وین کو روکا۔ پولیس والوں نے اسی وقت وائرلیس پر ایک ٹیکسی طلب کی۔ اُسے ہماری منزلِ مقصود کا پتہ دیا اور کہا کہ ان کے آگے آگے جا کر انھیں پہنچاؤ۔ چنانچہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہمارا خضرِ راہ بنا اور ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس نے نہ تو لمبا راستہ لیا اور نہ منزل پر پہنچ کر زیادہ کرایہ طلب کیا۔ اِن یورپئن لوگوں کو ہم سے کتنا کچھ سیکھنا ابھی باقی ہے !

نصر کا گھر کئی منزلہ عمارت میں ایک فلیٹ تھا۔ پوری بلڈنگ میں وہی ایک گھر تھا جس میں بتی جل رہی تھی۔ جب تک ہم وہاں پہنچے، ہم تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ جاتے ہی نصر اور اُس کے دوست مجھے وہسکی گلاس پیش کریں گے۔ حالانکہ مَیں نے پچھلے پانچ برسوں سے ڈاکٹروں کی ہدایت پر پینی چھوڑ رکھی ہے۔ مَیں نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ جب وہ لوگ پیش کریں گے تو مَیں انکار نہیں کروں گا کہ اس تھکے ماندے جسم کو گرمی ہی راس آئے گی۔ البتہ اگلے دن سویرے انھیں سمجھا دوں گا کہ رات گئی بات گئی۔ اب مجھے کوئی دعوتِ ناؤ نوش نہ دے۔

میرے اندازے کے عین مُطابق نصر کے مکان پر نصر اور اُس کے دوست علی صفدر، ابوطالب اور چاند شکلا بیئر پی رہے تھے۔ سب نے جوش و خروش سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میرے اندازے کے عین مُطابق

چاند شکلا نے مجھے ایک گلاس پیش کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں گلاس کو ہاتھ میں لیتا، نصر اس کی راہ میں حائل ہو گیا اور کہا کہ کلکتہ سے "انشا" کے مدیر ف۔ س۔ اعجاز کا فون آیا ہے اور اس نے خصوصی طور پہ ہدایت دی ہے کہ دلیپ سنگھ صاحب کو کوئی شراب نہیں پلائے گا کہ یہ شے ان کی صحت کے لئے اچھی نہیں ہے۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آپ کے کئی دوست بعض دفعہ کتنے خطرناک دشمن ثابت ہوتے ہیں۔

۷

عشق کی داستانوں میں میں نے پڑھا ہے اور فلموں میں بہ نفسِ نفیس دیکھا ہے کہ ایک لڑکے نے ایک لڑکی کو دیکھا اور دونوں کو ایک دُوسرے سے اتنی محبت ہو گئی کہ دِن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی۔ محبت تو مجھے بھی زندگی میں کئی بار ہوئی ہے لیکن اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کبھی نہیں ہوئی۔ میری طرف سے تو اکثر فوراً ہو جاتی تھی لیکن دوسری پارٹی کو رضامند کرنے میں خاصی ریاضت کرنی پڑتی تھی۔ نصر ملک کے گھر میں داخل ہوتے ہی البتہ میری وہی کیفیت ہوئی جو فلموں میں ہوتی ہے۔

اس کے دوستوں کو دیکھا اور یوں لگا جیسے اِن سب سے میری کئی سال کی شناسائی ہے۔ نہ کبھی سے باقاعدہ تعارف ہُوا نہ کسی کو اس کے اور اپنے بزرگوں کی پرانی دوستی کا ثبوت دینا پڑا۔ بس دیکھا اور میں اُن کی محبت کے رنگ میں رنگ گیا۔

اس وقت سعید انجم کو اور مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی کہ صُبح کے نکلے ہوئے تھے اور اب دوسری صبح جنم لے چکی تھی اور اس دَوران ایک بار

بھی آنکھ نہیں جھپکی تھی۔ لیکن محبت بھی تو ایک ٹانک ہے جو جسم کو طاقت اور دماغ کو تازگی بخشتا ہے۔ ہم دونوں بغیر کسی تکلف کے اُن کی گفتگو میں ایسے شامل ہوئے جیسے کوئی ایکسٹرا سٹیج پر اچانک چڑھ آئے، اپنے لئے رول خود منتخب کرے، اپنے لئے ڈائیلاگ گھڑے اور ڈرامہ کا حصّہ بن جائے۔

لطیفے گھڑے جا رہے ہیں، شعر سنائے جا رہے ہیں، ادیبوں کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ جوش وخروش کا ایک ریلا تھا جس نے ہم سب کو لپیٹ میں لے لیا۔

صُبح کاذب نمودار ہو رہی تھی تو کسی کو خیال آیا کہ دیپ سنگھ کو شاید آرام کی ضرورت ہو۔ چنانچہ سب نے اصرار کیا کہ مَیں اس فلیٹ کے واحد بیڈ روم میں جا کر سو جاؤں۔ مَیں محفل سے اُٹھا تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میری وہی حالت ہے جو غالبؔ کی ہوئی تھی جب اس کے ستم ظریف محبوب نے "غیر سے تہی" بزم کے ثبوت میں اُسے باہر بھجوا کر "یوں" کہا تھا۔ مَیں بستر پر دراز تو ہو گیا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کے شور و غل کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آئے گی۔ بہر حال، مَیں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہُوا۔

جب میری آنکھ کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے۔ مَیں نے بیڈ روم سے باہر نکل کر دیکھا تو ڈرائنگ روم میں باقی لوگ اس طرح سو رہے تھے جیسے ہمارے ہاں ریلوے پلیٹ فارموں پر سوئے رہتے ہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ رات ان لوگوں نے مجھے سونے کے لئے نہیں بھیجا تھا، بلکہ اپنے سونے کے لئے حالات ہموار کئے تھے۔

ایک آدھ گھنٹے میں تیار ہو کر ہم لوگ سعید انجم کی کار پر کوپن ہیگن کی سیر کو نکل گئے۔

راستے میں چاند تُشکلا مشہور اور قابلِ دید مقامات کی نشاندہی کرتا رہا۔ ہم لوگ کہیں رُکے نہیں۔ چاند نے خاص طور پر ایک پارک کی طرف اشارہ کیا، جس میں گاندھی جی کا بُت نصب تھا اور جسے گاندھی پارک کہتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ڈینش لوگ گاندھی جی کو عزّت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور انہیں اس عظیم انسان کی عظمت کا احساس ہے جب کہ ہم لوگ جو انھیں اپنی قوم کا "باپو" کہتے ہیں، زندگی میں ایسی ایسی حرکتیں کر رہے ہیں کہ اگر باپو دیکھ لے تو شاید اپنی سمادھی سمیت یہاں سے ہجرت کر جائے۔

گھومتے گھامتے ہم لوگ سمندر کے ساحل پر پہنچے۔ سمندر کے ساحل کے اس حصّے کو "لانگے لیانئے" کہتے ہیں۔ کوپن ہیگن میں کوئی سیّاح آئے اور لانگے لیانئے نہ جائے، یہ ممکن نہیں کیونکہ وہیں ننھی جل پری کا بُت نصب ہے کہ جس کے دم سے ڈنمارک کی شہرت ہے۔ ساحل کا یہ حصّہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس پر کئی پارک بنے ہوئے ہیں جن میں کئی بُت نصب ہیں۔ نیلگوں پانی میں جہاز اور کشتیاں تیرتی ہوئی بہت بھلی لگتی ہیں۔ ساحل پر بہت سے ریسٹورنٹ بھی ہیں۔ سیّاح چاہے تو کئی دن اس خوبصورت علاقہ کی سیر کرتے ہوئے گزار سکتا ہے۔

مَیں نے جب ننھی جل پری کا بُت دیکھا تو مجھ پر وہ کیفیت طاری نہ ہوئی جو ایک خوبصورت مجسّمے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ننھی جل پری اتنی ننھی بھی نہیں لگتی۔ وہ اُنّیس بیس سال کی اچھی خاصی دوشیزہ لگتی ہے۔ اس کی ایک معقول وجہ غالبًا یہ ہے کہ اس بُت کے خالق ایڈورڈ ایریکسن نے اسے بنانے کے لئے اپنی بیوی کو ماڈل کے طور پر استعمال کیا تھا اور ڈنمارک میں بیویاں سات آٹھ

سال کی نہیں ہوتیں۔ جل پری مجھے اتنی حسین بھی نہیں لگی کہ جتنی لوگ کہتے ہیں حالانکہ دوسروں کی بیویاں مجھے ہمیشہ حسین لگتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خود میری آنکھوں میں حسن کو پرکھنے والی روشنی میں کمی آگئی ہو۔

مَیں نے بھی ہر سیّاح کی طرح ننھی جل پری کے گلے لگ کر اپنی تصویر کھنچوائی۔ آپ کو اتنا تو پتہ ہی ہو گا کہ ننھی جل پری بچوں کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب کرسٹیان اینڈرسن کی کہانی کا ایک کردار ہے۔ دیکھ لیجئے دُنیا میں ایسے مُلک بھی ہیں جہاں ادیبوں کی کہانیوں کے کرداروں کے مجسّمے نصب ہیں اور ایک ہم ہیں کہ کسی ادیب کا مجسمہ بنا کر کھڑا کرنے کو بھی تیار نہیں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے کئی ادیب کم از کم مجسّمے کی صُورت میں خاصے حسین لگیں گے۔ میرے اپنے بارے میں کئی لوگوں کا خیال ہے کہ مَیں خاصا خوبصورت لگتا ہوں۔ —— اپنی تصویریں۔

مَیں کچھ بھی کہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ننھی جل پری کوپن ہیگن آنے والے ہزاروں جہاز رانوں کے لئے ایک تاریخی نشان بن گئی ہے۔ ملّاح اس پر پھُول نچھاور کر کے اپنی دِلی عقیدت اور پیار کا اظہار کرتے ہیں۔

لانگے لائنے کے قریب ہی شاہی محلات ہیں۔ بادیُ النظر میں ان میں محلات والی کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے سادگی صرف باہر کی دیواروں تک محدُود ہو۔ محل کا اندرونی حصّہ آراستہ پیراستہ ہو۔ لیکن اندر تو مجھے کسی نے جانے نہیں دیا۔

صرف عمارتوں میں ہی نہیں، شاہی خاندان کی کسی چیز میں وہ اکڑ فوں نہیں

جو ہم اپنے ملک کے شاہوں کو دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ہونی چاہیئے۔ ڈنمارک کی موجودہ حکمراں ملکہ مار گریٹے ثانی کے کئی رشتہ دار آپ کو لانگے لائنے پر گھومتے نظر آئیں گے۔ لیکن انھیں پہچاننے میں آپ کو تھوڑی دقت ہوگی کہ اُن کے آگے پیچھے پولیس کے دستے نہیں ہوتے۔ ملکہ کے خاوند کو ہم نے دیکھا کہ وہ سمندر کے کنارے بیٹھا بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔ دو ایک سیّاحوں کو اس نے اپنے پاس بُلا کر بیئر کی پیش کش بھی کی۔ مَیں بھی دو ایک بار اس کے قریب سے گزرا لیکن مجھے اس نے درگزر کر دیا۔ شاید اُسے خفیہ پولیس نے پہلے سے خبردار کر دیا تھا کہ مَیں بیئر نہیں پیتا۔

ایک طرف وہ حاکم ہیں اور ایک طرف ہمارے یہاں کے حاکم ہیں کہ حالانکہ پبلک کے ووٹ پر حاکم بنے لیکن بننے کے بعد پبلک سے ناطہ توڑ لیا۔ صرف ڈنمارک میں ہی نہیں، مَیں نے آسٹریا کی راجدھانی وی آنا میں دیکھا کہ اُن کا چانسلر اوپیرا دیکھنے آیا تو وہ عام لوگوں کی طرح اوپیرا ہاؤس میں پہنچا۔ عام لوگوں کی طرح ٹکٹ خریدا اور عام لوگوں کی طرح انٹرول میں پیسے دے کر کافی پی۔ اس کے آنے پر نہ پولیس نے رستے بند کئے اور نہ موٹر سائیکلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

ملکہ مار گریٹے ثانی نہ صرف یہ کہ اپنی رعایا میں مقبول ہیں بلکہ وہ اپنی رعایا کی چہیتی ہیں۔ حکومت تو خیر وہ کرتی ہی ہیں کہ یہ ان کا پیشہ ٹھہرا، لیکن ان کی مصوری کے بھی بہت چرچے ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ اینڈرسن کی ایک کہانی کو فلمانے کے لئے ملکہ نے سیٹ اور ملبوسات بھی ڈیزائن کئے تھے۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے یہ رواج ہوگیا ہے کہ جو خود کام نہ کرے وہ حاکم۔ مجھے یاد ہے

مجھے اپنی ملازمت کے دوران میں ایک دفعہ ایک اخبار کی ضرورت پڑی تو میں نے دوسرے کمرے میں اپنے ایک کولیگ سے فون پر درخواست کی کہ ذرا اخبار مجھے بھجوا دیجئے۔ دو تین گھنٹے تک اخبار تو میرے کمرے میں نہ آیا لیکن کولیگ موصوف خود ٹہلتے ہوئے آنکلے۔ میں نے شکایت کی کہ انھوں نے اخبار نہیں بھجوایا تو کہنے لگے کہ بھجواتا کیسے، چپراسی نہیں تھا۔

پوری شام ہم نے کوپن ہیگن کے بازاروں میں گھومتے گزار دی۔ اس سیر کے دوران نصر ملک نے ایک مکان کی نشاندہی کی جہاں ہانس کرسٹیان اینڈرسن نے بچوں کے لئے کہانیاں تخلیق کی تھیں۔ میں ایسی جگہوں کو ادیب کی زندگی میں بہت اہمیت دیتا ہوں کہ ادب کی تخلیق میں ماحول کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔

کچھ دن پہلے جب میں ملازمت سے سبکدوش ہوا تو مجھے خیال ہوا کہ مجھے ایک دفتر سا خریدنا چاہیئے جہاں بیٹھ کر میں یکسوئی سے لکھ بھی سکوں اور گپ شپ کے لئے اپنے دوستوں سے مل بھی سکوں۔ چنانچہ جیب میں اپنی پوری پونجی ڈال کر ایک پراپرٹی ایجنٹ کے ساتھ کناٹ پلیس میں جگہ کی تلاش کے لئے نکل پڑا۔ جو جگہ ایجنٹ نے مجھے دکھائی وہ ایک بڑی بلڈنگ کی دوسری بیسمنٹ یعنی نیچے کی طرف جائیں تو بلڈنگ کی دوسری منزل تھی کہ میری کل پونجی میں ہی خریدی جا سکتی تھی۔ ہوا کا تو وہاں گزر ہی نہیں تھا لیکن فضا وہاں کی ایسی تھی کہ جیسے میں کسی گہرے کنوئیں میں گر پڑا ہوں اور کنوئیں کے اوپر کسی نے ڈھکنا رکھ دیا ہے۔ ایسی جگہ میں بیٹھ کر کوئی شخص جعلی نوٹ تو چھاپ سکتا ہے لیکن ادب تخلیق

نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں نے اُسے خریدنے سے انکار کر دیا۔ انکار کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میرے اس دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد جب غیر ملکی سیّاح اردو طنز و مزاح کے عظیم ادیب دلیپ سنگھ کا وہ دفتر دیکھنے کے لئے آئیں گے جہاں بیٹھ کر وہ لکھا کرتا تھا تو شاید اتنی گہرائی میں پوشیدہ یہ جگہ ڈھونڈ ہی نہ پائیں۔

شام کو ہم سب نے ایک ہندستانی ریستوران میں کھانا کھایا۔ وہاں سے نصر کے دُوسرے دوست تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن چاند شکلا ہمارے ساتھ نصر کے گھر آگیا۔

بطور تعارُف میں چاند شکلا کے بارے میں کہہ دوں کہ وہ ڈنمارک کے ریڈیو سب رنگ کی ہندوستانی سروس کا سربراہ ہے اور ہندی میں چاند ہادی آبادی کے نام سے شاعری کرتا ہے۔

یہاں میں نصر ملک اور چاند شکلا کے تعلّقات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ ان تعلّقات کی مدد سے ہندو پاک کے تعلقات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

میرے خیال میں یہ دونوں کوپن ہیگن میں قریب ترین دوست ہیں۔ چاند نصر کے گھر میں یوں دندناتا پھرتا ہے جیسے یہ گھر اسی کی ملکیت ہو۔ نصر کا جو لباس اسے پسند آئے بغیر کسی تکلّف کے پہن لیتا ہے۔ جو کھانا چاہے اپنے آپ فریج سے نکال کر کھا لیتا ہے۔ نصر کے مہمانوں کو وہ اپنے مہمان سمجھتا ہے۔ لیکن دن میں اگر کم از کم پانچ بار یہ لڑ نہ لیں تو دونوں کو چین نہیں پڑتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دونوں اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ لڑائی ایک طے شدہ حد کے اندر رہے۔

کوپن ہیگن میں میرے قیام کے دَوران ایک دفعہ نصر نے چاند کی ڈیوٹی

لگائی کہ مجھے شہر کی سیر کرا لائے۔ اس ڈیوٹی کو نبھاتے ہوئے چاند نے مجھے وہ گلی کوچے بھی دکھا دیئے جہاں شریف آدمی جاتے تو ہیں لیکن کوشش اُن کی یہ ہوتی ہے کہ دُوسرے شریف آدمیوں کی نظر ان پر نہ پڑے۔ ایسی جگہ کی سیر میں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہم گھر پہنچے تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ اور نصر بے حد پریشان اپنے فلیٹ کے چکر کاٹ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے چاند پر برسنا شرُوع کر دیا۔ چاند نے کوئی وضاحت نہیں کی۔ بس سر جھکائے اس کی گالیاں سُنتا رہا۔ لیکن ایک مناسب وقت تک ڈانٹ کھانے کے بعد اُس نے چلّا کر کہا:۔

"نصر بہت ہو چکا۔ اب اگر ایک لفظ بھی تو نے اور بولا تو زندگی بھر کے لئے تیرے میرے تعلقات ختم۔"

نصر اس کے بعد واقعی ایک لفظ بھی نہ بولا۔

اگلی صُبح ہمارا پروگرام نصر کے دفتر ریڈیو ڈنمارک جانے کا تھا۔ نصر جب تیار ہوا تو اس نے نکر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اپنے لباس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اگر میرا دفتر پاکستان میں ہوتا تو مَیں سُوٹ پہنتا، ٹائی لگاتا اور جوتا چمکاتا تاکہ صرف اپنے کام سے نہیں بلکہ شکل وصورت سے بھی افسر لگوں۔ لیکن یہاں عہدے کے مُطابق نہیں، موسم کے مُطابق لباس پہنا جاتا ہے۔ دفتر پہنچے تو برآمدے میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو صرف نکر پہنے ہوئے تھے۔ مَیں نے نصر سے کہا کہ یقیناً یہ شخص اس دفتر کا افسرِ اعلیٰ ہوگا۔ کہنے لگا۔

"بالکل..... لیکن آپ نے کیسے پہچانا ؟"

مَیں نے جواب دیا:

"اس کے لباس سے۔ ہمارے ہاں جوں جوں آدمی ملازمت میں ترقی کرتا ہے، زیادہ کپڑے پہنتا جاتا ہے۔ یہاں لگتا ہے ترقی کے ساتھ ساتھ کپڑے اُترنے شروع ہو جاتے ہیں۔"

نصر نے جب یہ بات اپنے افسر کو ترجمہ کر کے سُنائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

نصر کو ڈنمارک کے اردو پروگرام کے سربراہ کی حیثیت سے جو پروگرام نشر کرنے ہوتے ہیں اس میں خبریں بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے ان خبروں میں ہندستان اور پاکستان کا خصوصی طور پر ذکر آئے گا۔ نصر کا یہ طریقۂ کار ہے کہ دفتر میں آتے ہی وہ اپنے کمرے میں لگے ہوئے کمپیوٹر سے اس دن پاکستان اور ہندوستان میں ہونے والے "حادثات" کا پتہ لگاتا ہے اور پھر ان سے ضروری خبریں اخذ کرا نھیں اردو میں منتقل کر کے بلیٹن تیار کرتا ہے جسے وہ خود اور اس کی دو ساتھی لڑکیاں ریڈیو سے نشر کرتی ہیں۔

ایک تو خیر سے "خبر" کہتے ہی آج کل اُسے ہیں جو اچھی نہ ہو۔ جب کوئی آپ سے کہتا ہے کہ سُنایئے کیا خبر ہے تو جواب میں یہ نہیں سُننا چاہتا کہ سب ٹھیک ہے۔ وہ تو یہ سُننے کے لئے بیتاب ہوتا ہے کہ یار کیا سناؤں بُرا حال ہے ـــ کل اماں غسل خانے میں گر گئیں..... وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے نصر کو بھی ایسی ہی خبروں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ اپنے دو ملکوں میں ہر روز ایسی حرکتیں ہوتی رہتی ہیں جنھیں سُن کر

ہمارے باہر بسے ہوئے ہم وطن شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ خبریں تو وہ بدل نہیں سکتے اس لئے غصہ نصر پر نکالتے ہیں۔ پاکستانی اسے ہندوستان کا ایجنٹ اور ہندوستانی اس کو ہندوستان کا دُشمن کہہ کر فون پہ گالیاں دیتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ قصور نصر کا نہیں کہ وہ خبریں خود نہیں گھڑتا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ دونوں ملکوں کے باشندے تخریبی کاموں سے توبہ کریں اور تعمیری کاموں میں جٹ جائیں تاکہ نصر کو سنانے کے لئے کوئی "خبر" نہ ملے۔ لیکن صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

اسی دن سعید انجم ناروے کے لئے روانہ ہو گیا۔

مَیں اور چاند ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر چاند کے دفتر ریڈیو سب رنگ میں آگئے کہ وہ اپنے پروگرام کے لئے میرا انٹرویو لینا چاہتا تھا۔ وہاں سے اُس نے ٹیپ ریکارڈ اٹھایا اور کہنے لگا کہ انٹرویو اسٹوڈیو میں نہیں بلکہ کسی اور مناسب جگہ پر ریکارڈ کریں گے۔

یہاں سے نکل کر ہم لوگ چاند کی دوست رگھور کو بیاک رسموتن کے گھر میں آگئے۔ رگھور ایک اعلیٰ پائے کی پینٹر اور فلم ساز ہے۔ ارادہ تو یہ تھا کہ ہم لوگ وہاں بیٹھ کر اپنا پروگرام ریکارڈ کریں گے لیکن مَیں تو جاتے ہی اس کی تصویروں میں کھو گیا جو اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں بکھری پڑی تھیں۔ میری اپنے کام میں دلچسپی دیکھ کر اس نے تجویز کیا کہ ہم لوگ لنچ اس کے ساتھ کریں تاکہ اُس سے تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ بعد میں ہم لوگ اپنا پروگرام بھی ریکارڈ کر لیں۔ رگھور نے تجویز کیا کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کے لئے کہیں گھوم آئیں تاکہ وہ کھانا بنانے پر مناسب

توجّہ دے سکے۔ گویا کھانا بنانے کو بھی وہ وہی توجّہ دینا چاہتی تھی جو ایک تصویر کی تشکیل کے لئے ضروری ہے۔

ہم لوگ نکل رہے تھے کہ نصر کے پروگرام کے نشر ہونے کا وقت ہو گیا۔ چاند نے ریڈیو آن کیا تو ہم نصر کی آواز میں خبریں سُننے لگے۔ خبروں کے خاتمے پر اس نے کہا:

"اب ایک ضروری اعلان۔ اُردُو کے جانے پہچانے طنز و مزاح نگار اور حکومتِ ہند کی وزارتِ خارجہ کے ماہوار رسالے" انڈیا پرسپیکٹوز" کے چیف ایڈیٹر دلیپ سنگھ تین دن کے لئے ڈنمارک آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات کے خواہش مند فلاں فون نمبر پر ان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔"

نصر کی محبّت سے سرشار اور میڈم رگمور کے مکمّل یکسوئی سے بنائے ہوئے لنچ کا تصوّر کرتے ہوئے میں چاند کو ساتھ لے کر وہاں سے نکلا اور ہندوستانی سفارتخانے کی طرف چل دیا کہ وہاں مجھے کچھ دوستوں سے ملنا تھا۔

۸

لنچ کے بعد چاند شُکلا نے میرا انٹرویو لینا شروع کیا۔ ہم لوگ ابھی ٹیپ ریکارڈر ٹیسٹ کر رہے تھے کہ میڈم رگمور نے آکر پوچھا:

"کیا آپ لوگ کافی پئیں گے؟"

چاند شُکلا نے تقریباً انھیں ڈانٹتے ہوئے کہا:

"کافی نہیں پئیں گے اور اس کے بعد آپ ہماری گفتگو میں مداخلت نہیں کریں گی۔ بس خاموشی سے بیٹھی رہیئے۔ سمجھیں؟"

یہ گھر میڈم رگمور کا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ہم لوگ اُن کی پُرتکلف دعوت کا لُطف لے چکے تھے اور اب چاند انھیں اس طرح ڈانٹ رہا تھا جیسے یہ گھر اسی کا ہو۔ مجھے احساس ہوا کہ ہندوستانی مرد کے خون میں یہ بات رچ بس گئی ہے کہ عورت کوئی بھی ہو اور کسی کی بھی ہو، مرد اس پر حکومت کرنے کا حق رکھتا ہے۔ کچھ سال اور مغرب میں رہنے کے بعد چاند شُکلا تو شاید سُدھر جائے لیکن ہم لوگ جو ہندوستان میں ہی رہ رہے ہیں، سُدھرنے میں ابھی بہت وقت لیں گے۔

انٹرویو میں چاند نے نہ صرف میری ادبی زندگی کے بارے میں سوالات کئے بلکہ کافی تفصیل سے انڈیا پرسپیکٹوز کے بارے میں بھی پوچھا۔ میں نے بڑی محبت سے اُسے سمجھایا کہ بہت سے لوگوں کے دماغ میں ایک غلط خیال بیٹھا ہوا ہے کہ سرکاری پرچے صرف پراپیگنڈہ کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے بطور ایڈیٹر ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اس رسالے کے ذریعے ہندوستان کا ایک عکس پیش کیا جائے جس میں ہندوستان کا حُسن تو نظر آئے ہی لیکن اس عکس میں جو دھبے دکھائی دیں ان پر پردہ نہ ڈالا جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ دُنیا کے مُختلف ملکوں سے جو خط مجھے موصول ہوئے ہیں ان میں اکثر قارئین مجھے لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے ذریعے ہمیں ہندوستان کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔

انٹرویو کے بعد میڈم رگمور نے ہمیں نہ صرف بڑھیا کافی سے نوازا، بلکہ میری بہت سی تصویریں بھی لیں۔ چاند شُکلا نے مجھے بتایا کہ میڈم رگمور کا شمار ڈنمارک کے بہترین فوٹوگرافروں میں بھی ہوتا ہے۔ میری تصویریں دیکھ کر چاند کی بات کا ثبوت مِل جاتا ہے، لیکن میرے نقش و نگار بھی تو ماشااللہ معمولی نہیں ہیں۔

میڈم رگمور سے بات چیت کے دوران میں نے اس کی فیملی کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگیں:

"میری ایک لڑکی ہے اور اگر قدرت کو منظور ہُوا تو اس سال اس کی شادی ہو جائے گی۔"

میں نے پُوچھا: "آج کل وہ کہاں ہے؟"

کہنے لگیں۔ "وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی ہے۔"

مَیں نے پوچھا:

"آپ کو کیسے یقین ہے کہ وہ دونوں اس سال شادی کرلیں گے؟"

کہنے لگیں: "ابھی کچھ دِن پہلے اُن کے ہاں بیٹا ہُوا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی محبت کی خاطر اپنے رشتے کو مستقل صُورت دے دیں گے۔"

ہمارے ہاں پہلے شادی ہوتی ہے اور پھر بچّہ۔ وہاں صورتِ حال یہ ہے کہ چونکہ بچّہ ہوگیا ہے اس لئے شاید شادی بھی ہوجائے۔ بظاہر تو یہ عجیب سی بات لگتی ہے لیکن اب ہمارے ہاں بھی یہ چلن عام ہورہا ہے۔ ابھی تک تو یہ سلسلہ ہماری فلمی دُنیا تک محدُود ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ ہی سالوں میں ہم لوگ ایسی باتیں سُن کر حیران نہیں ہوں گے۔ مغرب سے جب اور بہت سی بدعتیں ہم نے لے لی ہیں تو یہ کیوں نہیں۔

ریڈیو سب رنگ سے میرا انٹرویو اس شام کو نشر ہُوا جو کوپن ہیگن میں میری آخری شام تھی۔ اگلی صبح مجھے لندن کے لئے نکل جانا تھا۔ یہ ریڈیو لوگوں میں کتنا مقبول ہے اس کا احساس مجھے اس وقت ہُوا جب اگلے دِن ائرپورٹ پر مَیں نے دیکھا کہ بہت سے ہندوستانی مجھے الوداع کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ان میں دو سرکردہ ہندوستانی آیا سنگھ سردانہ اور سُکھدیو سنگھ سندھو اس بات پر ناراض بھی تھے کہ میرے آنے کی اطلاع انھیں میرے قیام کے دوران کیوں نہ دی گئی۔ اپنی محبت کے ثبوت میں انھوں نے وہیں ائرپورٹ سے خرید کر کچھ تحفے مجھے پیش کئے جو آج بھی میری لکھنے کی میز کی زینت ہیں۔

یہ تو ہم سب لوگ جانتے ہیں کہ مغربی ممالک میں جہاں باقی چیزیں بافراط ملتی ہیں، وہاں وقت کی بہت کمی ہے۔ چنانچہ ہم لوگ جب وہاں جاتے ہیں تو ہندوستانی یا پاکستانی دوست اکثر کہتے ہیں کہ صاحب' میں ذاتی طور پر آپ کی خدمت میں حاضر نہیں رہ سکوں گا لیکن میرے گھر کو آپ اپنا گھر سمجھئے۔ جو چیز چاہیئے بلاتکلف لے لیجئے۔ جو چاہیئے پکائیے' جو چاہیئے کھائیے۔ میرے ساتھ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ لیکن محبت کا جو نمونہ مجھے نصر ملک کے ہاں ملا وہ کہیں اور نہیں ملا۔ اس کی موجودگی میں مَیں اُس کے مکان میں جوتے کے لئے پالش تلاش کر رہا ہوں۔ الماریاں کھول کھول کر دیکھ رہا ہوں، لیکن وہ نہیں پوچھے گا کہ مجھے کِس چیز کی تلاش ہے۔ مَیں نے ایک دفعہ کہہ بھی دیا کہ بھائی پُوچھ تو لو کہ مَیں کیا ڈھونڈ رہا ہوں' تو کہنے لگا کہ آپ تو شاید کوشش کر کے ڈھونڈ بھی لیں لیکن مَیں اپنے گھر میں کچھ بھی ڈھونڈنے کا اہل نہیں ہوں۔

گاؤں کے ناتے مَیں اس کا بڑا بھائی لگتا ہوں۔ اور مجھے فخر ہے کہ اُس نے یہ رشتہ اسی طرح نبھایا جیسے چھوٹے بھائی کو نبھانا چاہیئے۔ مَیں جُوتا پالش کر رہا ہوں اور وہ میرے ہاتھ سے برش چھین کر خود کرنے لگے گا۔ مَیں قمیص استری کر رہا ہوں تو وہ ضد کرے گا کہ استری وہ کرے گا۔ کمال یہ ہوا کہ مَیں نے بھی اپنے آپ کو اس کے بڑے بھائی کے تمام اختیارات سونپ دیئے۔

ایک شام مَیں، نصر اور اس کی دوست سونی بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس طرح رات کا ایک بج گیا۔ مَیں تھکا ہوا تھا، اس لئے سونے کو اُٹھ

گیا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا غنودگی کے عالم میں تھا کہ دوسرے کمرے سے مجھے نصر کی آواز سنائی دی:

" بھائی جان میں سونی کے ساتھ ذرا گھومنے جا رہا ہوں۔ چابی ہم لوگ لے جا رہے ہیں۔ واپسی پر اپنے آپ دروازہ کھول کر آجائیں گے۔"

اسی وقت میرے اندر " بڑا بھائی " بیدار ہو گیا اور میں نے پورے اختیار سے کہا:

" اس وقت کہیں نہیں جانا۔ سو جاؤ آرام سے۔"

کمال یہ ہوا کہ نصر میری ڈانٹ کی وجہ سے چپ چاپ سو گیا۔ صبح ناشتے پر ہم لوگ بہت دیر تک میری اس حرکت پر ہنستے رہے۔ نصر نے مجھے بتایا کہ میرا "حکم" اس نے فوراً اس لئے مان لیا کہ وہ زندگی بھر بڑے بھائیوں کا حکم مانتا آیا ہے۔

اگلے دِن ہم کوپن ہیگن کی سیر کرتے رہے جس میں قابلِ ذکر ایک پارک تھا " ٹوولی "۔ پارک کیا تھا گویا دلچسپیوں کا ایک خزانہ تھا جس میں کوئی چاہے تو ہفتوں گزار دے۔ ناچ گانا، کلاسیکی موسیقی، ہوٹل اور ریستوران اور نہ جانے کام و دہن کی اور کیا کیا لذتیں تھیں۔ پیسہ پھینکتے جائیے اور تماشا دیکھتے جائیے۔ ویسے تو اس پارک میں ہم سب نے کئی چکر لگائے لیکن خصوصی طور پر میں نے دو جگہوں پر حاضری دی۔ ایک تو کلاسیکی موسیقی کا ایک تھیٹر تھا اور ایک ایسی جگہ جہاں کمپیوٹر کے ذریعے آپ کو قسمت کا حال بتایا جاتا ہے۔

یورپ میں لوگ کلاسیکی موسیقی کے بہت شوقین ہیں۔ موسیقی کے

بہترین آرٹسٹوں کو سننے کا موقعہ تو مجھے آسٹریا اور چیکوسلواکیہ میں ملا، لیکن کوپن ہیگن میں بھی جن آرٹسٹوں کو سنا، بہت اچھا بجا رہے تھے۔

ہم تھیٹر میں داخل ہوئے تو چاند شکلا نے میرے کان میں کہا کہ یہاں آرٹسٹ کی پہچان یہ ہے کہ وہ آپ کی طرح داڑھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب پردہ سرکا تو میں نے دیکھا کہ واقعی پانچ آرٹسٹوں میں سے چار کے داڑھی تھی ایک البتہ کلین شیو تھا لیکن جیسا کہ میں نے بعد میں چاند شکلا کو کہا، بجا وہ بھی ٹھیک ہی رہا تھا۔

کمپیوٹر کے ذریعے قسمت کا حال جاننا میرے لئے بہت ضروری تھا کہ مجھے ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہی ہے کہ وہ دن کب آئے گا جب میرا نام تاریخ کی کتابوں میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔

کمپیوٹر سے جو میری "قسمت" نکلی وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ کمپیوٹر نے یہاں تک کہہ دیا کہ ایک دن میرا شمار "حاکموں" میں ہوگا (میرے دشمن خبردار ہو جائیں) لیکن مجھے مزا بالکل نہ آیا۔ کمپیوٹر نے تو بس ایک جھٹکے میں میرے ہاتھ میں میری قسمت کا پروانہ تھما دیا لیکن جو لطف ہمارے ہاں "بھانڑے" کو ہاتھ دکھا کر آتا ہے وہ کمپیوٹر میں کہاں۔ یہاں جب بھانڑا میرا ہاتھ دیکھ کر کہتا ہے کہ دنیا کے ایک کونے میں ایک گوری عورت اپنا سب کچھ تجھ پر نچھاور کرنے کے لئے تیری تلاش میں ہے، تو بھانڑے کے ساتھ میری باچھیں بھی کھل جاتی ہیں اور جب میں اس کا پتہ معلوم کرنے کے لئے اس کی ہتھیلی پر پانچ کا نوٹ رکھتا ہوں تو اس کا جواب سن کر جی خوش

ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"سردار جی، پانچ روپے میں وہ بیچاری یہاں تک کیسے آئے گی۔ سفر کا اندازہ تو کیجئے۔"

اُس شام نصر ملک کے ایک بہت ہی جگری دوست علی صفدر کے ہاں ہماری دعوت تھی۔ علی صفدر پہلے پاکستان ائر لائنز میں ملازم تھا۔ اب اس کا اپنا کاروبار ہے۔ اس کی بیگم پاکستان ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھا کرتی تھیں۔ اُن کے ہاں نصر، چاند شکلا، ابوطالب کے علاوہ مجھے کچھ نئے دوستوں سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ ان میں انتظار حسین، ایم۔ ایم۔ خاں، ولایت حسین خاں صاحب کے نام مجھے خصوصی طور پر یاد ہیں۔

ڈنر کے بعد علی صفدر نے مشاعرے کی ایک محفل منعقد کی جس میں تقریباً سبھی مہمانوں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ ایسے موقعے پر مَیں کب پیچھے رہنے والا تھا۔ چنانچہ اپنی تین چار مزاحیہ غزلیں حاضرین کی نذر کیں جن پر دوستوں نے کھُل کر داد دی۔ جواب میں مَیں بھی کھُل کر "آداب عرض" کرتا رہا حالانکہ مَیں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ میری شاعری کتنے "آداب عرض" میں ہے۔

ڈنمارک میں یہ میری آخری شام تھی۔ اِن دوستوں سے بچھڑنے کا غم تو تھا ہی لیکن ایک خواہش بھی میرے دل میں تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ میرے دفتر کے ایک ساتھی نے، جو ڈنمارک کی پوسٹنگ کر چکا تھا، مجھے بتایا تھا کہ کوپن ہیگن میں ایک پارک ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پارک میں سیمنٹ کی ایک دیوار بنی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے ایک بڑے ٹب میں چینی

کے بہت سے برتن رکھے ہوتے ہیں جن کی قیمت سرکار اپنے پلّے سے دیتی ہے۔ لوگ وہاں آتے ہیں اور ٹب میں سے برتن اُٹھا اٹھا کر بہت غصّے سے سامنے دیوار پر پٹختے ہوئے گالیاں بکتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ مقصد اس "حرکت" کا یہ ہے کہ آپ اپنے دِل کا جمع شدہ غصّہ یہاں نکال لیں۔ آپ کو آپ کے باس نے ڈانٹ پلائی لیکن آپ اس کے سامنے کچھ بول نہ سکے کہ اس طرح شاید نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ لیکن آپ پارک میں جائیے۔ بہترین کراکری کو ہاتھ میں لیجئے اور دیوار پر پٹختے ہوئے کہئے کہ "حرامزادے مینجر، کل تو نے مجھے ڈانٹا تھا، اب دیکھ میرا وار سالے۔" اس طرح آپ نے دِل کا غبار بھی نکال لیا اور مینجر سالے کو خبر بھی نہ ہوئی۔

مَیں نہ صرف وہ پارک دیکھنا چاہتا تھا بلکہ وہاں بہت سے پیالے بھی توڑنا چاہتا تھا کہ مجھے اپنے بہت سے دُشمنوں سے بدلہ لینا تھا۔ میرے دشمنوں کی لسٹ اتنی طویل تھی کہ شاید ڈنمارک سرکار کی پوری کراکری ختم ہو جاتی۔ اس لسٹ میں بہت سے سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کے علاوہ کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں جنھوں نے زندگی میں مجھے بہت زخم دیئے ہیں۔ میری بدقسمتی اور اُن لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ مَیں ڈنمارک میں اپنے قیام کے دوران اس پارک میں نہ جا سکا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ لیا جائے کہ مَیں نے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا ہے۔ غصّہ اپنی جگہ بدستور موجود ہے، اور مجھے ان دشمنوں سے بدلہ لینا ہے۔ خیر صاحب، یار زندہ صحبت باقی۔

اگلے دن صبح نصر مجھے ساتھ لے کر ایک شاپنگ سینٹر میں لے گیا اور کہنے لگا کہ اگر کچھ خریدنا چاہو تو یہاں سے خرید لو۔ قیمتیں وہاں اس قدر زیادہ تھیں اور ابھی میری کرونر کے روپے بنانے کی عادت گئی نہیں تھی، اس لئے میں کچھ بھی نہ خرید سکا۔ خود نصر کا مشورہ تھا کہ ضروری چیزیں میں لندن جا کر خریدوں کہ وہاں قیمتیں اس سے آدھی ہوں گی۔

مجھے تو اس نے مشورہ دے دیا لیکن خود وہ کچھ دیر کے لئے ایک دکان میں گم ہو گیا اور جب وہاں سے باہر آیا تو میری بیوی کے لئے ایک نہایت ہی خوب صورت اور قیمتی تحفہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ میرے انکار کے باوجود وہ بضد تھا کہ یہ تو مجھے لے جانا ہی ہے۔ گھر لوٹے تو میں نے جس چیز کی بھی تعریف کی، اس نے میرے بیگ میں ڈال دی، چاہے وہ کوئی کتاب تھی یا کوئی اور چیز۔

جب میں ائرپورٹ کے لئے نکلا تو میری اٹیچی اس کے دیئے ہوئے تحفوں اور میرا دل اس کی محبت سے سرشار تھا۔

میرا اگلا پڑاؤ لندن تھا۔ لندن سے میرا ایک عجیب محبت کا رشتہ ہے۔ میں جب بھی وہاں گیا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ اپنا ہی "گراں" ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انگریز کی بات چیت سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ جاتے جاتے ہمیں اپنی زبان سے روشناس کرا گیا۔ اور دوسرے یہ کہ وہاں ہندوستانی اتنے زیادہ بس گئے ہیں کہ ساؤتھ ہال جیسے علاقوں سے گزرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنے ہی لدھیانے سے گزر رہے ہوں۔

مَیں نے لندن کے سفر کا ذکر کسی ادبی دوست سے نہیں کیا تھا۔ ارادہ میرا یہ تھا کہ چپکے سے لندن پہنچ کر اپنے بھتیجے کے گھر میں ڈیرہ ڈال دوں۔ اپنے طور پر لندن کی سیر کروں اور پھر آگے نکل جاؤں۔ لیکن میرے ارادے باندھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوتا تو وہی ہے نا جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

۹

لندن ایئرپورٹ پر مجھے لینے کے لئے میرا بھتیجہ موہن اپنے بچّوں سمیت آیا ہُوا تھا۔ اُن کے ساتھ گھر پہنچا تو میں نے انھیں بتا دیا کہ لندن میں مجھے تھوڑی سی شاپنگ کرنا ہے۔ اور اپنے طور پر بار بار دیکھا ہُوا تھوڑا سا لندن دیکھنا ہے۔ باقی سارا وقت اُن کے ساتھ گھر پر ہی گزاروں گا۔

ناروے اور ڈنمارک کے سفر کے دَوران ایک دن بھی مجھے کوئی گرم کپڑا پہننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی حالانکہ نصر ملک نے مجھے ہندوستان سے چلنے سے پہلے وارننگ دے دی تھی کہ میں اپنے ساتھ ایک برساتی نُما کوٹ اور گرم دستانے ضرور لاؤں۔ وہاں میں ٹی شرٹ میں ہی گھومتا رہا۔ ٹی شرٹ بھی اس لئے کہ ابھی ہم ہندوستانی اتنے باہمّت یا ہماری اپنی تہذیب کے مُطابق اتنے بے شرم نہیں ہوئے کہ ننگے بدن سڑکوں پر گھومتے رہیں۔ لیکن میں اگر ایسا کرنے پر اُتر آتا تو کم از کم موسم کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ میرا کئی بار جی چاہا کہ نصر کو شرمندہ کروں کہ اس نے مجھے برساتی اور دستانے لانے کو کیوں کہا تھا۔ لیکن شرافت کی وجہ سے ٹال گیا۔

لندن میں البتہ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ مَیں جب اپنے بھتیجے کے گھر کے باہر باغیچے میں گھوم رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ میری آواز تھوڑی بھاری ہو گئی ہے۔ اسی وقت نصر کا فون آیا۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد کہنے لگا:

"آپ کی آواز کچھ بھاری سی لگ رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کو زکام ہونے والا ہے۔"

مَیں نے کہا "ہاں یار، یہاں موسم تھوڑا ٹھنڈا لگتا ہے۔"

یہ سُن کر وہ بولا:

"مَیں نے تو ہندوستان میں ہی آپ کو خبردار کر دیا تھا کہ اپنے ساتھ برساتی نما کوٹ اور دستانے ضرور لے کر آیئے گا۔"

مجھے اس کے اس جُملے پر بہت ہنسی آئی۔ مَیں نے سوچا میرے زکام نے اس کے مشورہ کی عزت رکھ لی۔ اب مَیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا مشورہ غلط تھا۔

اس پر کئی سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔ جالندھر ریڈیو اسٹیشن پر ہمارا ایک دوست تھا ملہوترہ، جسے شراب کی لت تھی۔ چونکہ اس کی تنخواہ اس شوق کو پُورا کرنے میں زیادہ مددگار نہیں تھی، اس لئے اس سلسلے میں اسے اپنے دوستوں کی دریا دلی کو آزمانے کی ضرورت رہتی۔ اس کا طریقۂ کار یہ تھا کہ صبح دفتر آتے ہی وہ ایک دوست کے پیچھے لگ جاتا اور شام تک کسی نہ کسی طرح اس سے دس روپے نکلوا لیتا۔ ایک دِن وہ ایک ایسے شخص کے

پیچھے پڑا جس کا نام ستیش تھا۔

ستیش اپنی جگہ تہیہ کئے ہوئے تھا کہ وہ ملہوترہ کے جھانسے میں نہیں آئے گا۔ لیکن ملہوترہ بھی اس میدان کا پُرانا کھلاڑی تھا۔ شروع وہ اِس طرح ہُوا:

"یار ستیش آج دس روپے اُدھار دے دو۔"

"ہوتے تو ضرور دے دیتا۔ لیکن ہیں نہیں۔"

"کسی دوست سے مانگ کر دے دو، سخت ضرورت ہے۔"

"مَیں نے مانگے تھے۔ کِسی کے پاس نہیں ہیں۔"

"یار بھابی سے پُوچھ کر دیکھو۔"

"پوچھا تھا۔ اس کے پاس بھی نہیں ہیں۔"

"یار جب تمہارے پاس اور تمہاری بیوی کے پاس پیسے نہیں ہیں تو پھر تُم نے سگریٹ کیسے خریدے۔"

"لالہ سے ایک ڈبیہ اُدھار لی تھی۔"

"اگر لالہ سے اُدھار چلتا ہے تو یوں کرو کہ اُس سے دس ڈبیاں سگریٹ اُدھار لے لو، مَیں انھیں دس روپے میں بیچ کر اپنا کام چلا لوں گا۔"

ستیش نے جواب دیا کہ جب لالہ نے آج ایک ڈبیہ ادھار دی تو ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ آج کے بعد اُدھار نہیں ملے گا۔

اس طرح ملہوترہ ستیش کو مُختلف سجھاؤ دیتا رہا اور ستیش پینترا بدل بدل کر اس کے وار سے بچتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ ہم سب اس وقت

کینٹین میں چائے پینے کے لئے اکٹھا ہوئے۔ ملہوترہ اور ستیش بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہاں ہمیں ستیش نے یہ قصہ مزے لے لے کر سنایا کہ کس طرح ملہوترہ نے اُس پر کئی وار کئے اور سب کے سب خالی گئے۔ اپنی فتح کی خوشی میں اس نے زوردار قہقہہ لگایا جس کے دَوران اس کا پُورا منہ کھُل گیا۔ ملہوترہ نے اس کے مُنہ کے اندر بغور دیکھتے ہوئے کہا:

"یار ستیش، تیرا وہ دانت سونے کا ہے نا، اسے گروی رکھ دے تو میرا کام نِکل جائے گا۔"

نصر بھی ملہوترہ کی طرح مایوس نہیں ہُوا تھا۔ میرے ہلکے سے زکام میں اُسے سونے کا دانت نظر آگیا۔

موہن کے ساتھ طے یہ پایا کہ لنچ کے بعد ہم لوگ شاپنگ کے لئے نکلیں گے۔ لنچ کھا رہے تھے کہ میرے لئے ایک فون آیا۔ پتہ چلا کہ بخش لائل پوری بات کرنا چاہتے ہیں۔ مَیں حیران کہ بخش نے مجھے یہاں کیسے تلاش کر لیا۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ سب نصر کا کیا دھرا ہے۔

بخش لائل پوری اردو کا ایک خوش فکر شاعر ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا لیکن وہ انسان کتنا پیارا ہے۔ یہ لندن میں اس سے مل کر احساس ہُوا۔ اس نے بتایا کہ مَیں نے آپ کا بی بی سی اور لندن کے مقامی ریڈیو پر انٹرویو کا وقت طے کر لیا ہے۔ اور بتائیے لندن میں کیا ارادے ہیں؟

مَیں نے کہا کہ مَیں تو کُل دو دِن کے لئے آیا ہوں۔

میرا جواب سُن کر انھیں مایوسی ہوئی۔ کہنے لگے:

"میں تو آپ کے اعزاز میں دو تین جلسوں کا انتظام کر رہا تھا۔ بہر حال یوں کیجئے کہ آپ کسی طرح یہ دو انٹرویوز نبھائیے اور کل شام میرے گھر کھانا کھائیے۔ میں اپنے یہاں آپ کے چاہنے والوں کو اکٹھا کر لوں گا۔"

اب مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں لندن میں اتنے کم وقت کیلئے کیوں آیا۔ میں نے دلی فون کر کے اپنے افسر اور بیوی سے کچھ دِن اور لندن میں گزارنے کی اجازت مانگی۔ افسر تو مان گیا لیکن بیوی نے انکار کر دیا۔

میں اسی وقت شاپنگ کے لئے نکل گیا۔ وہاں سے واپسی پر میں نے موہن سے کہا کہ مجھے ہائڈ پارک میں چھوڑ دے کہ وہ بھی دلچسپیوں کی ایک آماجگاہ ہے۔

ہائڈ پارک لندن کا ایک وسیع میدان ہے جس میں لوگ اور باتوں کے علاوہ اپنا لیڈری کا شوق پورا کرنے آتے ہیں۔ مقرر اپنی میز اور لاؤڈ اسپیکر لے کر وہاں پہنچ جاتا ہے اور تقریر شروع کر دیتا ہے۔ سُننے والے اپنے آپ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح ایک اچھے خاصے جلسے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مقرر تقریر میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اور سامعین اس کی تقریر میں جتنے چاہیں کیڑے نکال سکتے ہیں۔ بظاہر صورت یہ نظر آتی ہے کہ ابھی دنگا شروع ہو جائے گا۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ گرما گرم مباحثے کے بعد لوگ ہنستے کھیلتے گھر چلے جاتے ہیں۔ سارا تماشہ دیکھنے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔

میں جب وہاں پہنچا تو ایک افریقی نوجوان تقریر کر رہا تھا۔ اُس کے

گرد اُس کے تھوڑے سے ہم وطن اور بہت سے انگریز کھڑے تھے۔ افریقی بڑی شرافت اور محبت کی زبان میں انگریزوں سے مخاطب تھا:

"میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کا مُلک ہے۔ ہماری حیثیت اس میں مہمانوں کی سی ہے۔ لیکن مہمان کو دشمن سمجھنا کہاں کا انصاف ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ ہم سے محبت سے پیش آئیں۔ ہمارے ساتھ اچھے میزبان کا سا سلوک کریں تاکہ ہم آپ کے اس حسین مُلک کی ترقی میں حصے دار بن سکیں۔ لیکن آپ لوگ تو ہمیشہ ہمارے لئے پریشانیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ مناسب بات نہیں ہے۔"

ایک انگریز اُسے ٹوکتے ہوئے بولا:

"یہ درست ہے کہ ہم آپ کے لئے پریشانیاں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ یہاں آتے ہی کیوں ہیں۔ اپنے ملک کو واپس کیوں نہیں چلے جاتے۔ یہاں سے آپ کو کسی نے دعوت نامہ تو نہیں بھیجا تھا۔"

اس پر افریقی نے جو جواب دیا اس پر گرما گرمی پیدا ہو گئی:

"ہم اس لئے آتے ہیں کہ آپ کی عورتیں ہم پر جان چھڑکتی ہیں —— تمہاری بیوی کی نظر کہیں مجھ پر پڑ گئی تو وہ فوراً تمہیں چھوڑ کر میرے ساتھ بھاگ کھڑی ہو گی۔"

اس جملے کے بعد دونوں طرف سے مغلظات کا وہ طوفان اُٹھا کہ الامان۔ اسی افراتفری میں جلسہ ختم ہو گیا اور مقرر اور سامعین قہقہے لگاتے ہوئے چلے گئے۔ ہمارا مُلک ہوتا تو تب تک پتھر برس گئے ہوتے اور

آنسو گیس کا استعمال ہو چکا ہوتا۔ کاش ہمارے ہاں بھی یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ جلسہ گاہ کی گرما گرمی جلسہ گاہوں میں ہی ختم ہو جایا کرے۔ پتہ نہیں یہ گلیوں اور محلوں میں کیوں در آتی ہے۔

رات دیر تک میں موہن کے ساتھ لندن کی رات کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اِس آوارہ گردی کے دَوران ہم نے وہ جوئے خانے بھی دیکھے جہاں امیر لوگ لاکھوں پونڈ کمانے کے چکر میں لاکھوں پونڈ ہار آتے ہیں۔ وہاں میری دلچسپی کا مرکز اُن مردوں اور عورتوں کے چہرے تھے جو وہاں دِل بہلا رہے تھے۔ زر کی بہتات کے بعد زندگی میں جو بوریت پیدا ہوتی ہے وہ اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ وہ جو دولت وہاں لٹا رہے وہ ایسی تھی کہ جس کے پیدا کرنے میں اُن کا خون پسینہ صرف نہیں ہُوا تھا اور جو دولت وہ کمانے کی کوشش کر رہے تھے وہ ایسی تھی کہ جس کی انھیں ضرورت نہیں تھی۔

اگلے دن صبح اُٹھ کر میں لندن کے اخبارات کے مطالعے میں لگ گیا۔ میری پُرانی عادت ہے کہ جس مُلک میں بھی جاؤں وہاں کے اخبارات کا مطالعہ ضرور کرتا ہوں لیکن ان میں وہ خبریں نہیں پڑھتا جن کا تعلق مقامی یا بین الاقوامی سیاست سے ہوتا ہے بلکہ وہ خبریں پڑھتا ہوں جو خصوصی مقامی خوشبو کی وجہ سے دلچسپیوں کا مرقع ہوتی ہیں اور اکثر میرے مضامین کے لئے مواد بہم پہنچاتی ہیں۔

مثال کے طَور پر میں امریکہ میں تھا جب میں نے وہاں ایک مقامی

اخبار میں ایک خبر پڑھی:

"نیوجرسی میں رنڈووں کی کانفرنس۔"

ہمارے ہاں سیاسی جماعتوں کی کانفرنس، کسانوں کی کانفرنس، ادیبوں کی کانفرنس تو آئے دن ہوتی رہتی ہے لیکن رنڈوے بھی کانفرنس کرتے ہیں، یہ مجھے وہیں جاکر معلوم ہُوا۔ بعد میں اسی خبر نے میرے مضمون "جشنِ جُدائی" کو جنم دیا۔

مَیں آسٹریا میں تھا تو مَیں نے ایک جلسے کے بارے میں پڑھا جس میں غیر ملکیوں کو خصوصاً مدعو کیا گیا تھا۔ جلسے میں زیرِ بحث موضوع یہ تھا کہ اگر آپ آسٹریا میں مر جائیں تو کیا ہو گا۔ مَیں نے نہ صرف یہ خبر پڑھی بلکہ جلسے میں بھی گیا۔ بعد میں اسی جلسے کی کارروائی میرے مضمون "مرنا تیری گلی میں" کا موضوع بنی۔ چنانچہ ان کے اخبارات کا مطالعہ میرے لئے نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوتا ہے بلکہ کئی دفعہ مجھے لکھنے کے لئے نئے نئے موضوعات مل جاتے ہیں۔

اس بار لندن میں جو خبر مجھے دلچسپ لگی وہ مندرجہ ذیل تھی:

"مناکو کے شہزادہ رینیر کی کنواری سیتری شہزادی اسٹیفنی امّید سے ہے۔ اس نے ایک بیان میں بتایا کہ اس کے ہونے والے بچّے کے باپ کا نام ڈینیل ڈیورٹ ہے جو شہزادی کا سرکاری طور پر مقرّر کیا گیا ذاتی محافظ ہے۔ شہزادی نے مزید بتایا کہ وہ عنقریب ڈینیل سے شادی کر رہی ہے۔" زندگی میں مَیں نے عشق تو بہت کئے ہیں لیکن ڈینیل جیسا چاہنے والا پہلی بار ملا ہے جو میری دولت

میری پوزیشن یا میری خوبصورتی سے نہیں بلکہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

مَیں بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ شہزادی اپنی دولت، اپنی پوزیشن اور اپنی خوبصورتی سے تعلق کیسے توڑے گی میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ خود "ذاتی محافظ" صاحب کوشش کریں گے کہ اب جب کہ انھوں نے ایک شہزادی کو اپنے دامِ عشق میں گرفتار کر لیا ہے تو اُن کے خاندان کو بھی شاہی خاندان تسلیم کیا جائے۔

ناشتے کے بعد ہم لوگ شاپنگ کے لئے ساؤتھ ہال کو چل دیئے۔

ساؤتھ ہال لندن کا وہ علاقہ ہے جو ایشیائیوں کی آماجگاہ ہے۔ وہاں عام طور پر کوئی انگریز نظر نہیں آتا۔ ایشیائی نہ صرف اس علاقے پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں بلکہ اُن کے کلچر کی بہت سی جھانکیاں وہاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ مَیں نے باقاعدہ سڑک پر ایک آدمی کو ہاتھ والا لاؤڈ اسپیکر ہاتھ میں لئے اعلان کرتے ہوئے سُنا کہ آج رات کو فلاں سنیما میں مدر انڈیا دکھائی جائے گی۔ ایسے اعلان تو اب ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی نہیں ہوتے۔ لندن میں رہ کر جگر اؤں کے کلچر کو زندہ رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

شام کو پانچ بجے بی بی سی پر میرا انٹرویو تھا۔ انٹرویو عبید صدیقی نے لیا۔ عبید پہلے آل انڈیا ریڈیو دہلی اسٹیشن پر اردو سروس کے ساتھ منسلک تھے۔ آج کل بی بی سی کی اُردو سروس میں ملازمت کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے شک تو ہوا کہ میرا اُن سے تعارف ہے لیکن لندن کے

ماحول میں یاد نہ آیا کہ اُن سے پہلے ملاقات کہاں ہوئی تھی۔

اُن کا انٹرویو کا طریقۂ کار مجھے اچھا لگا۔ پہلے تو انھوں نے ایک مضمون سُنانے کو کہا۔ اس کے بعد اس مضمون کی روشنی میں انھوں نے میری مزاح نگاری کے متعلق سوالات کئے۔ میرے خیال میں میں نے وہاں اپنا مضمون "اپنا کندھا اپنی لاش" سُنایا تھا۔

یہاں تک تو انٹرویو بہت اچھا چلا۔ بعد میں پتہ نہیں کیسے گفتگو کا رُخ اس طرف مڑ گیا کہ اچھا مزاح پاکستان میں لکھا جارہا ہے یا ہندوستان میں۔ یہ سوال مجھے بھنا دیتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ادب کے اچھے یا بُرے ہونے کا تعلق جغرافیائی حدوں سے نہیں ہوتا۔ مشتاق یوسفی یا محمد خالد اختر کو ہم لوگ اگر ہندوستان لے آئیں تو وہ پھر بھی اچھا ہی لکھیں گے۔ اسی طرح اگر مجھے آپ لاہور لے جا کر چھوڑ دیں تو میری تحریروں میں فرق نہیں آنے والا۔

اس سلسلے میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ کچھ سال پہلے دہلی دُور درشن اور جالندھر دور درشن کے لئے پروگرام دہلی ہی سے تیار کئے جاتے تھے۔ ویسے تو دہلی دور درشن کا عملہ آکاش وانی بھون کی چوتھی منزل پر اور جالندھر دور درشن کا عملہ تیسری منزل پر بیٹھا کرتا تھا لیکن عملے میں اکثر ادلا بدلی بھی ہوتی رہتی تھی۔ دونوں اسٹیشنوں کے لکھنے والے ادیب بھی وہی تھے۔ اس کے باوجود مجھے باہر کے لوگ اکثر کہتے تھے کہ جالندھر کے پروگرام دہلی کے پروگراموں سے اچھے ہوتے ہیں۔ ویسے تو ہم نے سُن رکھا ہے کہ دُور کے

ڈھول سُہانے ہوتے ہیں لیکن یہاں تو دونوں ڈھولوں میں صرف ایک منزل کا فرق تھا۔

ایک اور سوال جس پر عبید نے بہت زور دیا وہ یہ تھا کہ انشائیہ وہ ہوتا ہے جسے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب انشائیہ کہتے ہیں یا وہ ہوتا ہے جو مَیں لکھ رہا ہوں۔ مَیں نے کہا کہ میرے کئی مضامین وزیر آغا صاحب کے رسالے "اوراق" میں انشائیے کے عنوان کے تحت شائع ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ میرے انشائیوں کو انشائیے مانتے ہیں۔ لیکن جس طرح کے انشائیے وہ خود لکھتے ہیں، میرے انشائیے اس طرح کے نہیں ہوتے۔ ذاتی طور پر مَیں اس بحث سے کتراتا ہوں کہ انشائیہ کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس سوال کا جواب جانے بغیر جانے ہی نہ دے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

انٹرویو کے بعد عبید صدیقی صاحب سے بہت محبت کی گفتگو ہوئی۔ تب تک مجھے یاد بھی آچُکا تھا کہ عبید دہلی کے ہمارے بہت پُرانے ساتھی ہیں۔ کاش یہ بات پہلے یاد آجاتی تو مَیں اُن سے کہہ دیتا کہ بھیّا انٹرویو میں مُشکل سوال نہ پوچھنا۔

کچھ دیر ان کے دفتر میں بیٹھ کر ہم دہلی کے اپنے اور ان کے دُوسرے دوستوں کو یاد کرتے رہے۔ انھوں نے لندن میں مُستقل سکونت اختیار کرنے کے سِلسلے میں اپنی جدّوجہد کے کئی دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

انھی کے دفتر سے مَیں نے ساقی فاروقی صاحب کو فون کیا، جو اُن دنوں اپنے گھر میں کسی بیماری سے نبرد آزما تھے۔ کچھ عرصہ پہلے دہلی میں اُن سے مُلاقات

ہوئی تھی اور اُن کی بہت سی نظمیں اور غزلیں سُننے کا موقع ملا تھا۔ ساقی فاروقی صاحب میری اس بات کا ایک اور ثبوت ہیں کہ اچھی شاعری کسی بھی جغرافیائی حد میں کی جا سکتی ہے۔

بی بی سی کے انٹرویو کے بعد میرا ارادہ تھا کہ انڈین ہائی کمیشن میں بھی حاضری دوں۔ لیکن جب تک میں بُش ہاؤس سے فارغ ہوا، انڈین ہائی کمیشن بند ہو چکا تھا۔ چنانچہ لندن کے فیشن ایبل بازاروں میں گھومتے گھامتے ہم لوگ گھر لوٹ آئے۔

۱۰

جب مَیں کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں میرے دو سینئیر تھے جن سے میری گہری دوستی ہو گئی جو آج تک قائم ہے۔ ایک تو آج اُردو کا صفِ اوّل کا شاعر ہے۔ بلراج کومل ۔۔۔ اور دوسرا ہربنس سنگھ بھولا، آج کل امریکہ کی یونیورسٹی انڈیانا میں ماس کمیونی کیشن کا پروفیسر ہے۔

کالج کے زمانے میں ہم تینوں اپنے محدود ذرائع کے باوجود سال میں ایک دو بار ہندوستان کے مختلف شہروں کو دیکھنے نکل جاتے تھے ۔۔۔ اِن سفروں میں کومل اور مَیں بھولے کی ایک بات سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ وہ ایک معمولی عمارت، گلی یا محلّے کو اپنے تخیّل کے زور سے جاندار بنا دیتا تھا۔

مجھے یاد ہے، ایک بار ہم برندابن کی گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ بظاہر تو ان گلیوں میں دیکھنے کو کچھ تھا نہیں، سوائے ڈھیر سارے بندروں کے، جو وہاں آزادانہ گھوم کر مسافروں کو پریشان کر رہے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ بھولے کے تصوّر نے ان ویران گلیوں میں رنگ بھرنا شروع کیا:

"... یہی وہ گلیاں ہیں"، بھولا بولا۔" جہاں کرشن مہاراج گوپیوں کے سنگ راس رچایا کرتے تھے۔ وہ جب اپنی بنسری پر اپنے ہونٹوں سے ایک مدُھر تان چھیڑتے تھے تو حسین دوشیزاؤں کے ٹولے موہت ہوکر اُن کے پیچھے ہولیتے تھے۔ لڑکیاں اُن سے بات کرنے کو ترس رہی ہیں لیکن سانورا بظاہر اُن سے بے خبر اپنی دھُن میں مست آگے بڑھتا جارہا ہے" میں آج بھی گوپیوں کے شکوے اور شکایتیں سُن رہا ہوں "سانورے اتنے کٹھور نہ بنو۔ دِل وجان سے تم پر فدا اِن لڑکیوں کے سنگ بیٹھ کر ان سے باتیں کرو۔ سنو! تمہارے پیچھے آئی ہوئی تمہاری محبت کی دیوانی ان لڑکیوں کے پاؤں میں کانٹے چبھ گئے اور ان سے خون بہہ نکلا تو اس خون کی ذمے داری تم پر ہوگی سانورے۔"

بھولا اس طرح ہمیں اپنے تصوّرات کی دُنیا میں لئے پھرتا رہا۔ ہم جب وہاں سے لوٹے تو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ہم برندابن کی ویران گلیوں کو دیکھ کر نہیں آرہے ہیں بلکہ اس پوُرے نظارے کو دیکھ کر آرہے ہیں جن کی وجہ سے یہ گلیاں ایک یادگار بن کر رہ گئی ہیں۔

اسی طرح فتح پور سیکری میں گھومتے ہوئے جب ہمارے گائڈ نے ایک سوکھا ہوا تالاب دکھاتے ہوئے، جس میں بظاہر کچھ بھی نہیں تھا، یہ کہا کہ یہ وہ تالاب ہے جہاں مغل شہزادیاں غسل فرمایا کرتی تھیں، تو بھولے کا تخیل حرکت میں آگیا۔ اس سوکھے ہوئے تالاب میں ایک دوسری سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی مغل شہزادیوں کے قہقہے ہمیں سنائی دینے لگے

اور تالاب کے شیتل پانی میں اُن کے حسین جسموں کی آنچ سے شعلے اُٹھتے دکھائی دینے لگے۔

اس وقت تو ہم بھولے کی حرکتوں پر ہنس دیتے تھے لیکن بعد میں دُنیا بھر میں آوارہ گردی کرتے ہوئے مجھے احساس ہُوا کہ ایک شہر یا ایک گلی، ایک مکان یا ایک مقبرہ تو گارے اور مٹّی کی بنی ہوئی عمارتیں ہیں۔ اُن کا لُطف تو ہم تبھی لے سکتے ہیں جب ہم اپنے تصوّرات میں وہ ہستیاں اور وہ زمانہ پیدا کر لیں جن کی وجہ سے ان گلیوں یا ان مکانوں نے شہرت پائی۔

لندن میں اپنے آخری دن دو ایک مقامات دیکھتے ہوئے مَیں بھی اپنے دوست ہربنس سنگھ بھولا کے انداز میں تصوّرات کی دُنیا میں کھو گیا تھا۔ فرق ہم دونوں میں یہ تھا کہ بھولا تو اجڑے ہوئے مقامات کو رنگ و نور سے سجا دیتا تھا۔ مَیں نے صرف یہ کیا کہ اپنے تخیّل کے زور پر ایک سجے سجائے میوزیم کا حصّہ بن گیا۔

یہ تب ہوا جب میں لندن کا ایک مشہور میوزیم "مادام تساڈ" دیکھنے گیا۔ کیا ہوا یہ بتانے سے پہلے کچھ مادام تساڈ کے مومی عجائب گھر کے بارے میں بیان ہو جائے۔

مادام تساڈ کا اصلی نام میری تھا۔ وہ ایک سپاہی کی بیٹی تھی جو میری کی پیدائش سے پہلے ہی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا تھا۔ میری کی ماں ایک ڈاکٹر فلپ کریٹیس کے گھر میں ملازم ہو گئی۔ وہیں میری کی پرورش ہوئی۔

ڈاکٹر کرٹینیس کو مجسمہ سازی کا شوق تھا۔ اسی کی تربیت میں میری نے مجسمہ سازی سیکھی۔ ۱۷۹۵ء میں میری نے ایک سِوِل انجنیئر فرانکوئس تساڈ سے شادی کر لی اور اس طرح وہ میڈم تساڈ کے نام سے جانی جانے لگی۔

میڈم تساڈ نے مجسمہ سازی میں بہت شہرت پائی۔ اپنے فن کی نمائش کے لئے اس نے لندن کی بیکر اسٹریٹ میں ایک عجائب گھر تعمیر کروایا۔ یہ عجائب گھر جو اب قومی ملکیت ہے، کئی دَور دیکھ چکا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں اس میں آگ لگا دی گئی تھی اور اس کا کافی نقصان ہوا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے دوران اس عجائب گھر پر بمباری کی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کے کئی مجسمے تباہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اس عجائب گھر کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اب قریب قریب ۲۰ لاکھ لوگ ہر سال اسے دیکھنے آتے ہیں۔

اس عجائب گھر میں سیاست دانوں، آرٹسٹوں، شہرت یافتہ کھلاڑیوں اور مشہور ادیبوں اور اُن کے ادبی کرداروں کے مجسمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کہیں کہیں مجسموں کی شکل میں پورے سین بھی دکھائی دیتے ہیں، جیسے شہزادی ڈائنا اور شہزادہ چارلس کی شادی کی تقریب (اب جب اس شادی کو گہن لگ رہا ہے تو پتہ نہیں اس موم کا کیا بنے گا جس سے یہ مجسمے بنائے گئے ہیں۔)

اس عجائب گھر کی سجاوٹ کے لئے جو پھول آپ کو جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں وہ بھی موم کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک مجسمہ جو مجھے بہت ہی دلچسپ

لگا وہ میوزیم کے داخلے پر نصب ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ وہ میوزیم کا ہی ایک فرد ہے جو وہاں آپ کو میوزیم کے بارے میں جانکاری دینے کے لئے کھڑا ہے۔ اسی تعلق سے کئی لوگوں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی اور پھر اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

ہمارے اپنے کئی سیاسی سربراہ جیسے مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی تو مجھے وہاں نظر آئے لیکن کوئی ہندوستانی ادیب وہاں نظر نہ آیا۔ شاید یہی بات میرے ذہن میں تھی جب میں بھولے کی طرح تصوّرات کی دُنیا میں کھو گیا۔ مجھے محسوس ہُوا جیسے مَیں بطور ادیب دُنیا بھر میں شہرت حاصل کر چُکا ہوں۔ میرے مرنے کے بعد موم سے بنایا ہُوا میرا مجسمہ تیار ہو چُکا ہے اور اُسے میڈم تساڈ کے عجائب گھر میں سجایا جا چُکا ہے۔ شائقین پانچ پونڈ کا ٹکٹ خرید کر عجائب گھر میں داخل ہوتے ہیں اور باقی مجسّموں کو سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے میرے مجسمے کے آگے آ کھڑے ہوتے ہیں اور دیر تک میرے نقش و نگار اور میری پگڑی کے اسٹائل کو دیکھتے رہتے ہیں۔

تصوّرات کی دُنیا میں کھویا ہُوا جب مَیں عجائب گھر سے باہر نکلا تو خود حیران تھا کہ ایک مجسمہ بن جانے کے بعد مَیں چل پھر کیسے رہا ہوں۔ پھر میرے تصوّرات میں وہ بے شمار جلسے اور جلوس گھومنے لگے جن میں اُردو کے کئی ناقد اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ میڈم تساد کے عجائب گھر میں دلیپ سنگھ کا مجسمہ کیوں لگایا گیا ہے۔ اُن کو شکایت تھی کہ مجھ سے سینئر

کئی اور ادیب ہیں جو اِس اعزاز کے زیادہ حقدار ہیں۔

ادیبوں کا ایک جلوس بھی مجھے دکھائی دیا جس میں وہ نعرہ لگا رہے تھے:

عجائب گھر میں
ہمیں لگاؤ

جب جلوس پارلیمنٹ کے پاس پہنچا تو سارے ادیب یوں ساکت و جامد کھڑے ہو گئے جیسے وہ مجسموں میں تبدیل ہو چکے ہوں۔ وہ شاید ہمارے حکمرانوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ مجسمے بن کر وہ کیسے لگیں گے۔ کچھ ایک کی صورت دیکھ کر مجھے ترس بھی آیا کہ میں اپنی جگہ پر انھیں کھڑا کردوں لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔

وہاں سے گھومتا گھماتا میں ٹرافلگر اسکوائر آگیا کہ یہ بھی لندن کا ایک ایسا مقام ہے جسے دیکھے بغیر آپ کا لندن کا سفر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ ٹرافلگر اسکوائر کے بیچوں بیچ ۱۴۵ فٹ اونچا ایک ستون بنا ہوا ہے جس پر نیلسن کا بُت ایستادہ ہے۔ یہ وہی نیلسن ہے جو ۱۸۰۵ء میں لڑی گئی ٹرافلگر جنگ کا فاتح تھا۔ اس اسکوائر کے چاروں کونوں پر کانسی کے بنے ہوئے ببر شیروں کے بُت نصب ہیں۔ اسکوائر کے اندر دو تالاب ہیں جن میں ہر وقت دو فوارے چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اس خوبصورت اسکوائر کی اصلی خصوصیت کبوتروں کے وہ جھنڈ ہیں جو ہر وقت یہاں دانہ چگتے نظر آتے ہیں۔ لوگ دانہ پھینکتے ہیں اور کبوتر ان کے ارد گرد منڈلانا شروع

کر دیتے ہیں۔ منڈلانا کیا وہ تو باقاعدہ اُن کے کندھوں اور سروں پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مسافر اپنی تصویریں کھنچواتے ہیں تاکہ سند رہے کہ وہ لندن دیکھ آئے ہیں۔ تصویر کے دوران کبوتر پلک نہیں جھپکتے اور پر تک نہیں مارتے کہ تصویر کہیں خراب نہ ہو جائے۔

مَیں نے بھی ٹرافلگر اسکوائر میں کبوتروں کو دانہ کھلایا تاکہ اُن کے ساتھ ایک فوٹو کھنچوا سکوں۔ حسبِ رواج دو کبوتر میرے سر پر آبیٹھے۔ تصویر ہو گئی تو مَیں نے سوچا کہ حسبِ رواج وہ میرے سر سے اتر جائیں گے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ مَیں نے ہاتھ سے انھیں اڑانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مَیں پریشان ہو گیا۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ مَیں تو ان کی دو منٹ کی رفاقت سے پریشان ہو گیا ہُوں، لیکن میرے بُت میں تبدیل ہو جانے کے بعد تو ان کی رفاقت تاعمر اور تا سلامتی مجھے نصیب رہے گی تو پھر کیا کروں گا۔ (تاعمر سے میرا مطلب ہے اُن کی عمر اور سلامتی سے مراد ہے میری سلامتی، کہ میٹیریل اچھا نہ ہو تو بُت گر بھی سکتا ہے اور میٹیریل آج کل بھی گھٹیا نہیں ہوگا تو پھر کب ہوگا۔)

چنانچہ اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر مَیں تصوّرات کی دُنیا سے باہر آیا اور توبہ کی کہ اپنا بُت کبھی نہیں بننے دوں گا۔ نہ مرنے سے پہلے، نہ مرنے کے بعد۔

اسی شام بخش لائل پوری صاحب کے گھر ڈنر تھا۔ مَیں اُن کے گھر پہنچا تو اُن کے دُوسرے تمام مہمان وہاں پہلے سے مَوجُود تھے۔ اُن میں اخبار "جنگ" کے امین مغل اور انور خالد تھے۔ یونس تنویر تھے، پنجابی کے شاعر

چمن لال چمنؔ تھے اور بخشؔ کے امریکہ سے آئے ہوئے ایک مہمان خواجہ خالد تھے۔

بخش نے اپنے گھر کے لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔ اُن کی بیگم نے نہایت خلوص سے میرے گھر والوں کی خیریت پُوچھی۔ ڈنر کے دوران میں نے دیکھا کہ بخش انھیں کسی بات پر چڑا رہے تھے جس کے جواب میں وہ ہم لوگوں سے خوش اخلاقی برتتے ہوئے موقعہ ملتے ہی بخشؔ کو اشارتاً ڈانٹ بھی رہی تھیں۔

اس محفل میں میری حیثیت مہمانِ خصوصی کی تھی۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ مَیں اپنا کوئی مضمون سناؤں۔ مَیں نے شاید "معذرت نامہ" سُنایا تھا جس پر تمام دوستوں نے دِل کھول کر داد دی۔ مَیں شاید ذرا تیزی سے پڑھ رہا تھا۔ بخشؔ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کئی بار سمجھایا کہ آہستہ پڑھو اور ہر اچھے جملے پر داد کی گٹھری باندھ کر آگے بڑھو۔ لیکن مَیں اُسی رفتار سے چلتا رہا۔ مجھے پتہ تھا کہ مَیں کتنا بھی تیز پڑھوں، ادب کے یہ سمجھدار قاری میرا کوئی جملہ "ضائع" نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن مجھے بخشؔ کے اشارے بہت اچھے لگے۔ وہ یقیناً چاہتے تھے کہ مَیں اس احساس کے ساتھ گھر لوٹوں کہ لندن میں مجھے جھولیوں داد ملی۔

مضمون کے پڑھنے کے بعد فرمائش کی گئی کہ مَیں ایک اور مضمون سناؤں۔ مَیں نے "خالی جگہ پُر کرو" سُنایا جس پر داد کا وہی زور شور رہا۔ مَیں یہاں خصوصی طور پر خالد خواجہ کی داد کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ وہ جب کسی جملے

پر خوش ہوتے تھے تو زور زور سے اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر قہقہے لگاتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مَیں فلاں مضمون یا فلاں شعر پر کھل کر ہنسا لیکن خالد خواجہ کی طرح کھُل کر ہنستے ہوئے مَیں نے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے۔

حالانکہ وہاں موجود سبھی لوگ ادیب اور شاعر تھے لیکن کسی نے اپنی کوئی چیز نہ سُنائی۔ مَیں نے جب اس طرف اشارہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو سُننے آئے ہیں، سُنانے نہیں۔ اس پر مَیں نے دلّی کی محفلوں کا ذِکر کیا جہاں لوگ بظاہر مہمان کو سُننے آتے ہیں، لیکن حقیقتاً اُسے سُنانے آتے ہیں اور کئی دفعہ اتنا سُناتے ہیں کہ مہمان بیچارہ اپنے اشعار بھُول جاتا ہے۔

اگلے دن چھ بجے صُبح مجھے فلائٹ لینی تھی۔ مَیں گھر پہنچا تو عاشور کاظمی صاحب کسی ذاتی کام کے سِلسلے میں مجھ سے مِلنے آئے ہوئے تھے۔ اُن سے قریب ایک گھنٹہ بات چیت رہی۔

دو ایک گھنٹے کی نیند کے بعد مَیں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا کہ چار بجے مجھے ایئرپورٹ پر حاضری دینی تھی۔

چھ بجے جب مَیں جہاز میں بیٹھا تو بُری طرح تھکا ہُوا تھا۔ میں نے قریب ایک گھنٹہ آنکھیں بند کر کے اُن نئے دوستوں کا تصوّر کیا جن سے اس سفر میں باقاعدہ مُلاقات ہوئی تھی۔ اس تصوّر سے دِل خوشیوں سے بھر گیا۔ لیکن جسم بُری طرح تھکا ہُوا تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اب کئی دن گھر جا کر پڑا

رہوں گا۔ مُلک کے باہر تو کیا، مُلک کے اندر بھی آوارہ گردی کرنے نہیں نکلوں گا۔ عین اُسی وقت میرا دل کچھ اس طرح سے دھڑکا جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ میرے اس ارادے سے مُتفق نہیں ہے۔ اُسے تو آوارگی کا چسکا لگ چُکا ہے۔ وہ مجھے آرام کہاں کرنے دے گا۔ مرزا غالب نے شاید میرے ہی دل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا تھا:

میں اور اِک آفت کا ٹکڑا وہ دِلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دُشمن اور آوارگی کا آشنا

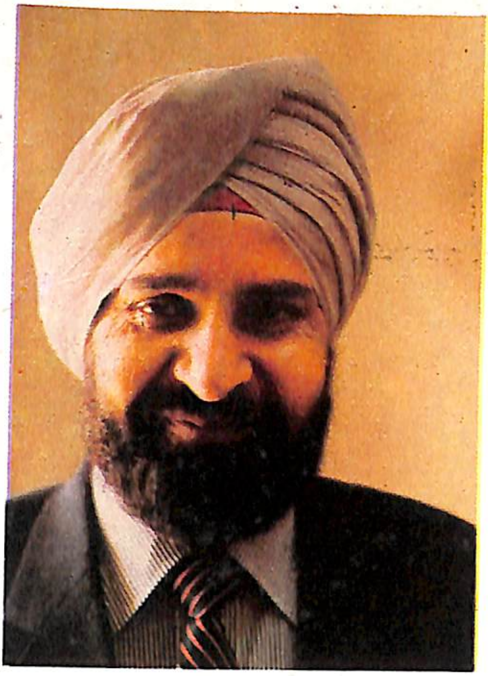

دلیپ سنگھ کا جنم ۱۹۳۲ء میں ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں ہُوا۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ دلی میں بس گئے۔

دلیپ سنگھ طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اُن کے مضامین کے دو مجموعے "سارے جہاں کا درد" اور "گوشے میں قفس کے" شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے کی صنف میں بھی اُن کا نام کسی تعارف کا مُحتاج نہیں۔ ان کا ڈرامہ "موم کی گُڑیا" شائع ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے مُتعدد ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے ٹی وی سیریل "تصویر کا دُوسرا رُخ"، "دِل دریا"، "یہ دُنیا غضب کی" اور "دُوسرا کیول" بہت پسند کئے گئے۔ حال ہی میں ان کا ناول "دِل دریا" اور ہندی میں ان کے مزاحیہ مضامین کا مجمُوعہ "جنم دن کی تلاش" شائع ہو چکے ہیں۔